نشورِ واحدی

شخصیت اور فن

ڈاکٹر محمد ارشد خاں

نشورؔ واحدی

شخصیت اور فن

ڈاکٹر محمد ارشد خاں

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

نشورؔ واحدی

فہرست

پیشِ لفظ	پروفیسر آمر لاری	۱۱
حرفِ آغاز		۱۳
باب اول :	حیات	۱۷
باب دوم :	شخصیت	۶۱
باب سوم :	جدید شاعری کا اجمالی جائزہ	۸۹
باب چہارم :	نشور واحدی کی غزل گوئی	۱۲۵
باب پنجم :	نشور واحدی کی نظم نگاری	۱۷۵
باب ششم :	نشور واحدی کی نثر نگاری	۲۲۳
باب ہفتم :	نشور واحدی کا متفرق کلام	۲۴۵
حرفِ آخر		۲۶۷
کتابیات		۲۷۳

ضمیمہ

(الف)	انٹرویو	۲۸۳
(ب)	خطوط	۳۱۲

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

نشور واحدی

پیش لفظ

مجھے نشورؔ صاحب سے ان کی زندگی کے آخری دور میں بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی شاعری کا مداح تو تھا ہی، ان کے حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار سے بھی میں بے حد متاثر ہوا۔ ان کی شخصیت پر تصوف کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کی سادہ مزاجی درویش منشی اور زندگی طرف بے نیازی کا رویہ اس کے گواہ ہیں۔ ان کی شخصیت کے نقوش ان کی شاعری کے آئینہ خانے میں ہر گام پر جلوہ گر ہیں۔

نشورؔ واحدی نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا، اس وقت اقبالؔ کی شہرت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ نشورؔ واحدی اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبالؔ سے بے حد متاثر تھے۔ "صہبائے ہند" (۱۹۴۰ء) اور شورِ نشور (۱۹۴۲ء) کی نظمیں طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ ادا ہر لحاظ سے اقبالؔ کی نظموں کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن یہ نظمیں صرف اقبالؔ کی نظموں کی بازگشت نہیں، ان میں نشورؔ کی آواز کی کھنک بھی شامل ہے۔ "صہبائے ہند" کی غزلوں میں بیشتر عارفانہ رنگ نمایاں ہے۔ نظموں میں اگر وہ اقبالؔ سے متاثر تھے تو غزلوں میں جگرؔ سے۔ اپنی ایک فارسی رباعی میں انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

ان کا تیسرا مجموعہ "آتش دنم" ۱۹۴۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ان کے پچھلے مجموعوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں وہ اقبالؔ کے سحر سے آزاد ہو چکے ہیں اور ان کی انفرادیت پورے طور پر نمایاں ہو گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "آتش دنم" میں نشورؔ نے مفکر شاعر کا لبادہ اتار دیا ہے اور وہ ایک نیم رومانی

اور نیم حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ پچھلے مجموعوں سے مختلف ہے۔ اس کی زبان میں ہندوستانی رنگ نمایاں ہے، اور اس کا لہجہ نرم اور شیریں ہے۔

"آتش دنم" میں خاصی تعداد میں نظمیں بھی ہیں۔ لیکن بعد میں نشورؔ نے غزل ہی کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے بعد کے مجموعے "فروغِ جام" (۱۹۵۹ء)، سوادِ منزل (۱۹۶۸ء) اور گلِ افشانیِ گفتار (۱۹۷۷ء) بیشتر غزلوں ہی پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ غزل گو ہی کی حیثیت سے نشورؔ کو اردو شاعری میں ایک امتیازی اور منفرد مقام حاصل ہوا۔

نشورؔ کی غزلوں میں روایت کا تحفظ بھی ہے اور اس کی توسیع بھی۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں اگر عارفانہ رنگ ہے، تو بعد کی غزلیں تغزل کی رنگینیوں، حسن و جمال کی کیفیات اور زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے اسلوب میں سادگی کے ساتھ پرکاری ہے، تشبیہوں اور استعاروں میں جدت و ندرت ہے، اور آہنگ میں ایسی نغمگی ہے جو دلوں میں اتر جاتی ہے۔

نشورؔ واحدی پر ایک ایسی جامع کتاب کی ضرورت تھی جس میں ان کی حیات اور شخصیت کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہو، اور ان کے علمی و ادبی کارناموں اور بالخصوص ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر محمد ارشد خاں کی یہ کتاب اس ضرورت کو بوجہِ احسن پوری کرے گی، اور علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

احمر لاری

ادبستان، رحمت نگر
گورکھپور۔ ۲۷۳۰۰۱

۲۰ جنوری ۱۹۹۸ء

حرفِ آغاز

بیسویں صدی کی چوتھی تا چھٹی دہائی میں جن شعرا نے غزل کے ذریعے اردو زبان و ادب کو بامِ عروج تک لے جانے کی کوشش کی اور اس ضمن میں اردو غزل کو نئی جہات اور اسالیب سے آشنا کیا، ان میں نشور واحدی کو ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ دنیائے شعر و ادب میں نشور واحدی ایک غزل گو کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوئے۔ اُس عہد میں شہرت اور مقبولیت کے لحاظ سے جگر مراد آبادی اور فراق گورکھپوری کے علاوہ کوئی اور غزل گو ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

نشور واحدی نے غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھلائے، رباعیات و قطعات لکھے، ایک مثنوی بعنوان "صہبائے ہند" قلم بند کی اور مثنوی مولانا روم کے دفترِ اول کا منظوم ترجمہ کیا۔ نثر میں بھی ان کی دو کتابیں اور چند مضامین ہیں، اور ایک فارسی کتاب "تاریخِ بنگالہ" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

نشور صاحب کے محولہ بالا علمی و ادبی کارناموں اور غزل میں ان کے اکتسابات کے پیشِ نظر راقم السطور نے اپنی تحقیق کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ یہ مقالہ سات ابواب، حرفِ آخر، کتابیات اور دو ضمیموں (انٹرویو

اور خطوط) پر مشتمل ہے۔

باب اول نشور واحدی کی حیات اور باب دوم ان کی شخصیت سے متعلق ہے۔ باب سوم جدید شاعری کے اجمالی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی سے لے کر ترقی پسند تحریک تک کے شعرا کے کلام کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، تاکہ اس تناظر میں نشور واحدی کی شاعری کا محاکمہ کیا جائے۔

باب چہارم میں نشور واحدی کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ اس مقالے کا اہم ترین باب ہے، کیونکہ نشور واحدی کو غزل گوئی ہی کی بدولت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس باب میں تاریخی ترتیب سے نشور واحدی کی غزل گوئی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، جس سے ان کے ذہنی سفر کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔

باب پنجم نشور واحدی کی نظم نگاری، باب ششم ان کے نثری کارناموں اور باب ہفتم دیگر اصناف میں ان کے کلام کے تجزیہ و تنقید پر مشتمل ہے۔

حرفِ آخر میں نشور واحدی کی علمی و ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے، اور اردو شاعری میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں کتابیات اور دو ضمیمے شامل ہیں۔ ضمیمہ (الف) دو غیر مطبوعہ انٹرویو اور ضمیمہ (ب) دس خطوط پر مشتمل ہے۔

مقالے کی تکمیل کے دوران، مواد کی فراہمی سے لے کر ترتیب و تحریر تک، ہر مرحلے میں استادِ محترم پروفیسر احمر لاری نے، جن کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا گیا، میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی اور اپنے بصیرت افروز مشوروں سے نوازتے رہے۔ ان کرم فرمائیوں کے لیے میں ان کا تہِ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔

علاوہ ازیں جن اصحاب نے اس مقالے کی تیاری میں میری ہر ممکن مدد کی، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

پروفیسر محمود الٰہی، ڈاکٹر اختر بستوی، ڈاکٹر افغان اللہ خاں، ڈاکٹر ابرار اعظمی، ڈاکٹر منور انجم، محترمہ مومنہ چشتی (اہلیہ نشور واحدی مرحوم)، جناب نیاز واحدی (پسر نشور واحدی مرحوم)، محترم رفیق عابد زاہدی، جناب پیام فتحپوری، ڈاکٹر شکیل اعظمی، جناب سرسوتی سرن کیف، جناب ماہنور احمد اور مولانا ضیاء المصطفےٰ قادری۔

میں مذکورہ بالا تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں۔ اگر ان لوگوں کا پرخلوص تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ مقالہ اپنی موجودہ صورت میں مکمل نہ ہو پاتا۔

میری زندگی کا ایک ایک لمحہ والد محترم مولانا عبدالجبار خاں رہبر اعظمی کی شفقتوں اور بے پایاں عنایتوں کا رہینِ منت ہے۔ مقالے کی تکمیل اور پھر ڈگری ملنے پر انھوں نے جس خوشی کا اظہار کیا وہ میرے لیے باعثِ تقویت ہے۔

۱۹۹۱ء میں اس مقالے پر ڈگری ملی، لیکن مالی وسائل کے فراہم نہ ہونے کے سبب اب تک یہ اشاعت کا منتظر رہا۔ اب یہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، اترپردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس ادارے کے ارباب حل وعقد کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کی اشاعت کی راہ ہموار کی۔

نشور واحدی پر پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب پیش کرتے ہوئے جہاں مجھے بے حد خوشی ہے، وہیں اس بات کا افسوس بھی ہے کہ نشور واحدی جیسے ممتاز اور منفرد شاعر پر آج تک کوئی [illegible]

انھیں دنیا سے رخصت ہوئے کم وبیش پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ شاید یہ حقیر کوشش مجھ سے بہتر اہلِ قلم کو اس طرف متوجہ کرے۔

محمد ارشد خاں

رہبر منزل
خالص پور۔ اعظم گڈھ
پن: ۲۷۶۱۳۸

۱۵ر جنوری ۱۹۹۸ء

باب چہارم

نشورؔ واحدی کی غزل گوئی

نشور واحدی کی ابتدائی تعلیم میں فارسی زبان و ادب کو کافی دخل رہا ہے۔ اس حد تک کہ وہ اول اول شعر بھی فارسی ہی میں کہا کرتے تھے۔ اور ابتدائی تعلیم و تربیت تو ہر شخص کے پس منظر کا کام کرتی ہے ان کی شاعری کے پس منظر میں ایک سوال کے جانے پر انھوں نے اپنے جواب میں اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میرا خاص پس منظر یہ ہے کہ مجھے دلچسپی تھی مشرق کے فلسفے سے، مشرق کے تصوف سے، مشرقی تہذیب سے، اور پرشین کے اعلیٰ نمونے سے، خاص طریقے سے رومی اور خواجہ حافظ شیرازی کا دیوان میرے مطالعے میں ہمیشہ رہتا تھا"[1]

لیکن ظاہر ہے رومی سے استفادہ کرنا اقبال جیسے عظیم شاعر فلسفی کے لئے ہی ممکن تھا، یوں بھی رومی کے یہاں معروف معنوں میں غنائیت کم کم ہی ملتی ہے۔ تصوف میں، جس کی بلندیوں کا ذکر نشور نے کیا ہے، رومی کے یہاں "بلند درجے کی غنائیت ہے جس کو غزل کے قالب میں ڈھالنے کے لئے غالب جیسا غزل گو چاہیئے

---

[1] نشور واحدی سے شفاعت علی سندیلوی کا انٹرویو، مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء

تھا۔ اس کے مقابلے میں حافظ کی غزلوں میں تصوف بھی تلاش کیا جا سکتا ہے اور تغزل تو بھرپور ہے مع تمام روایتی علامات (ساقی، مے، میخانہ وغیرہ) کے نشور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے حافظ کی طرف متوجہ ہوئے وہ خود کہتے ہیں:۔

"میں رومی کی طرح سے پیغام نہیں دے سکتا تھا۔ مگر حافظ شیرازی کی طرح سے غزل کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ حافظ شیرازی کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہی شعر رومانٹک بھی ہوتا ہے، وہی شعر آئینہ خانے میں پڑھا جا سکتا ہے، وہی شعر بارگاہِ ناز میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور وہی شعر سماجی انقلاب میں بھی استعمال ہوتا ہے"[1]

مندرجہ بالا قول سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حافظ شیرازی کی شاعری کے مطالعے سے نشور واحدی کی شعری صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ اور انھوں نے حافظ شیرازی ہی کی طرح شعر کہنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر ایک شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

یہ شام ابھی کیا ہے، بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی مے خانہ سنبھلتا ہے

علاوہ ازیں اردو شعرا میں، جنھوں نے نشور واحدی کو متاثر کیا۔ ان میں علامہ اقبال اور جگر مرادآبادی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کے اثرات نشور واحدی کی ابتدائی شاعری پر کم و بیش دیکھے جا سکتے ہیں۔ نشور واحدی نے ایک رباعی میں ان سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے ؎

---

[1] نشور واحدی سے شفاعت علی سندیلوی کا انٹرویو، مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء

زاں پیش کہ روشن گریٔ عقل وخبر بود
کیفے بمن آمیختۂ ذوق و نظر بود
در جام من گم شدہ ترکیب دگر یافت
آں مے کہ بخم خانۂ اقبال وجگر بود

اس میں شک نہیں کہ شعوری طور پر کم از کم اوائل شعر گوئی میں نشور نے اقبال کا تتبع کیا ہے ؎

فریب مشرق و مغرب ہیں رہروانِ جدید
یہ بدنصیب نہ عاقل ہوئے نہ فرزانے

دلِ عاشقانِ رضا طلب صنم آشنا ہی سہی مگر
تری مسجدوں کا یہ برہمن مرے بتکدے کا امام ہے

زندگی گرمیٔ احساس پہ نازاں ہے ابھی
ذوقِ آتش ہو تو ہر شعلہ گلستاں ہے ابھی

اس میں بھی شک نہیں کہ عشق و مستی کی بے باکی میں وہ جگر مرادآبادی کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں ؎

یہاں سجدہ وہاں سجدہ، معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ
وہ جلوہ مستانہ وہ زلفِ پسِ شانہ
برباد کنِ کعبہ، غارت گرِ بت خانہ

نشور واحدی اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں روایتی قسم کی شاعری کرتے رہے اس زمانے میں ان کا اپنا وہ مخصوص لب و لہجہ ابھر کر سامنے نہیں آیا تھا جس کی بنا پر آج وہ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ دراصل نشور واحدی اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں اپنی آواز تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ یہی تلاش انھیں کبھی حافظ شیرازی اور کبھی اقبال و جگر کی طرف لے جاتی ہے یہ جستجو اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک وہ محسوس نہیں کر لیتے کہ ان کی جستجو کامیابی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔

نشور کیا کوئی بھی شاعر اپنے گرد و پیش یا اپنے ماحول اور قدیم روایات سے یکسر انحراف نہیں کر سکتا وہ بھی غزل کا شاعر۔ اسی لئے اگر نشور کی ابتدائی شاعری میں روایتی رنگ یا اساتذہ کی پیروی کی جھلک نظر آتی ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عمر بھر ان پر یہ اثرات حاوی رہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک منزل پر پہنچ کر انھوں نے ان اثرات سے خود کو پوری طرح آزاد کر لیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران اس بات کا خود اعتراف کیا ہے :-

"تقریباً دس سال تک اپنی شاعری میں کبھی جگر کی طرح تشنہ لب ہوتا تھا اور کبھی اقبال کی طرح ملکوں اور قوموں کے حالات پر نظر رکھتا تھا۔ لیکن میرا مزاج ان کے مزاج سے الگ تھا۔ میں زیادہ لچک دار قسم کے شعر کہنا پسند کرتا تھا۔ جو بہت نرم، نازک اور منطقی اصول کے اندر ہوں"[1]

نشور واحدی نے اپنی شاعری کا آغاز اسی ادبی فضا میں کیا جو حسرت موہانی،

---

[1] نشور واحدی سے کے۔ کے نیر کا انٹرویو، مورخہ ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کی تھی۔ بقول انعام درانی " غزل، اصغر، جگر اور رئیس المتغزلین، حسرت موہانی کے زمانے میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی گہنہ مشق شمشیر زن کے سامنے قلم تراش چاقو لے کر کھڑا ہو گیا ہو، مگر تخیل اور ترنم کے اس نہایت کٹھن زمانے میں بھی نشور نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اس لئے کہ ان کی شاعری ہی نہایت منہ زور تھی۔"[1]

کسی بھی بڑے شاعر کی طرح نشور کی بھی اپنی آواز اور اپنا مخصوص لب و لہجہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس آواز میں قدما کی آواز بھی شامل ہے اور ایسا ہونا عین فطری بھی ہے کیونکہ جس طرح شاعر یا ادیب اپنے عہد یا خود اپنی ذات سے فرار حاصل نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح اپنے سے پیشتر کی شعری روایات سے بھی انحراف نہیں کر سکتا۔ اور اپنے دور کی تحریکات اور رجحانات سے بھی اس کا متاثر ہونا ضروری ہے، یعنی جب کوئی شاعر یا ادیب کوئی فن پارہ ترتیب دیتا ہے یا کوئی ادبی تجربہ کرتا ہے تو اس میں نہ صرف اس کا عہد اور اس کی ذات بلکہ وہ تجربہ بھی شامل ہوا کرتا ہے جو پچھلی نسل ورثہ کے طور پر نئی نسل کو سپرد کرتی ہے۔ بڑا ادیب اور شاعر وہی ہوا کرتا ہے جو پرانے تجربوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے عہد کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے، جس میں اس کا ذاتی نقطۂ نظر بھی شامل ہوتا ہے۔ نشور واحدی نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنی غزلیہ شاعری کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو کیا کچھ دینے کی کوشش کی ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے اس دعوے میں پورے بھی اترتے ہوں :-

" ہمارے یہاں تجربات اور فکر کی بھیڑ ہوتی ہے۔

---

[1] انعام درانی ، صہبائے ہند (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۸۹ء ص ۷۲

ازدحام ہوتا ہے، فکر کا زیادہ ہجوم ہے، میں اس فکر کے ہجوم کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں اسے سنبھال کر بہت ہی آسان طور پر بیان کر دوں۔ مثال کے طور پر ایک شعر دیکھئے ؎

اس طرف عیش کی شمعیں تو ادھر دل کے چراغ
دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے

اس سے زیادہ آسان کہنا بہت مشکل ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر مسلسل فکر کر رہا ہے، جو پہلے ذوق کی منزل میں تھا اب فکر کی بھیڑ میں پھنس گیا ہے تو بڑے گہرے اور پھیلے ہوئے افکار کو نچوڑ کر اور آسان بنا کر پیش کرنا یہ میرا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔"[1]

مندرجہ بالا عبارت سے نشور واحدی کے نظریۂ شعر پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے شعری محاسن کے سلسلے میں جو دعوے کئے ہیں اس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اور ان کی شاعری ان کے دعوں پر کس حد تک پوری اترتی ہے اسے جانچنے اور پرکھنے کے لئے ان کی غزل گوئی کے چار ادوار قائم کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۰ تک
۲۔ دوسرا دور ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۶ تک
۳۔ تیسرا دور ۱۹۴۶ سے ۱۹۵۹ تک
۴۔ چوتھا دور ۱۹۵۹ سے ۱۹۸۲ تک

---

[1] نشور واحدی سے کے۔ کے نیر کا انٹرویو ، ۱۵ر جولائی ۱۹۸۶ء

پہلے دور (صہبائے ہند) کی غزلوں میں صوفیانہ و عارفانہ کلام کی تعداد بہت زیادہ ہے، چونکہ نشور واحدی کا تعلق صوفیوں کے خاندان سے تھا۔ اور ان کی تعلیم بھی خانقاہوں اور مدرسوں میں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کو جو ماحول ملا وہ مذہبی ماحول تھا۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالشکور چشتیؒ سے بیعت بھی تھے۔ اور ان سے روحانی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اسی لئے ان پر دینی رنگ غالب تھا انھوں نے عملی طور پر تصوف کے ہر گوشہ کی سیر بھی کی تھی اسی لئے ان کے کلام پر بھی تصوف کا گہرا اثر پڑا مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا دیکھا دل نے
میں وہ مضمون ہوں کہ عنوان ہے انساں میرا

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تخت طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا سطوتِ شاہانہ مستی میں

دیا ساقی نے اول روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں ناآشنائی کر ہوا دیوانہ مستی میں

نشورؔ آخر وہاں بھی رشتۂ ساقی نہیں ٹوٹا
تجلی بن کے آیا شاہدِ مے خانہ کعبے میں

کیا بات ہے تیرے لئے تکمیلِ آرزو
اے وہ کہ تو نے خاک سے انساں بنا دیا

جسے دنیا میں اربابِ نظر اللہ کہتے ہیں
اسی کو اضطراب درد میں ہم آہ کہتے ہیں

دیکھتا ہوں تجھ کو یکساں جلوہ گر دونوں جگہ
میں نہیں سمجھا کہ تو دل میں ہے یا محفل میں ہے

ہمیں اے خواب خوش بے خوابیٔ ہجراں غنیمت ہے
ابد تک جاگ کر پھر حشر تک سونا ہی سونا ہے

اللہ اللہ رے شاہد مقصود
دیکھ سکتا ہوں پا نہیں سکتا

دھوئے مرے ضمیر سے اسرار فلسفہ
اے وہ کہ تو ہے ساقیٔ طوفانِ بے خودی

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ نشور واحدی پر تصوف کا اچھا خاصہ اثر تھا۔ اور وہ جگرؔ، اصغرؔ اور حسرتؔ کی طرح تصوف کا علمی و عملی ذوق رکھتے تھے اور اس مسلک و مشرب کی بہت سی خوبیاں اور خصوصیات ان کے فکر و وجدان کا حصہ بن چکی تھیں، اس ذوقِ لطیف کے سبب دنیا اور

ابنائے زمانہ سے بے نیازی و بے پروائی حالات و واقعات اور ماحول سے ایک طرح کی یگانگی، اور انھیں ایک وسیع، ہمہ گیر اور کائناتی پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش، رجائی اور امید پرستانہ ذہنیت، ماورائی اور روحانی نقطۂ نظر، انسان دوستی اور حق پرستی، عاشق اور حسن طلبی، محویت اور فنائیت، مستی اور سرشاری جیسی کیفیات ان کے کلام میں گھل مل گئی تھی[1] انھوں نے تصوف کے مضامین انوکھے انداز میں پیش کیے ہیں۔ جو ان کے ہم عصروں سے بالکل مختلف ہیں اور جدت طرازی کی مثال ہیں۔

خمریات کے موضوع پر بھی نشور واحدی نے خاصی تعداد میں اشعار کہے ہیں، جو جگر مرادآبادی اور ریاض خیرآبادی کی یاد دلاتے ہیں۔ مگر ریاض کے یہاں جو چلبلاپن ہے اور جگر کے یہاں جو شراب میں ڈوب جانے کی کیفیت ہے وہ نشور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں شراب کے ذکر میں سرشاری اور سرمستی تو ہے مگر اس کے باوجود ایک ٹھہراؤ ہے۔ چونکہ نشور واحدی عملی طور پر اس شغل رندی سے دور تھے اسی لئے ان کے یہاں ایک طرح کی پاکیزگی نظر آتی ہے ؎

عالم مُرید آپ کا اور آپ مے مُرید
تقوے میں رنگ قبلۂ عالم نہ پوچھئے

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لاساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

---

[1] شمس تبریز خاں "شعر نشور میں آفاقیت سے ماورائیت تک" نیا دور فروری ۱۹۸۶ء ص ۲۴

اوروں سے راہ مصحف و زنار پوچھئے
ہم سے سلوکِ خانۂ خمار پوچھئے

کیا جانیں ان رموز کو صوفی و فلسفی
رندوں سے کائنات کے اسرار پوچھئے

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی کیا میں بھولا ہوں رہِ خانہ مستی میں

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے، یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اٹھا اور اٹھ کے جا لپٹا، میں بے تابانہ مستی میں

سجدۂ مے تو میری اصل عبادت ہے نشور
آپ سمجھیں تو سہی مذہب رنداں میرا

خود پی لیں یا پلا دیں کسی تشنہ کام کو
کیا دیکھتے ہیں ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

کہتا تھا سجدہ خم کو، ساغر کو مے کشوں کو
مے پی کے رات ساقی کیفِ نماز میں تھا

نشورؔ اٹھو کہ سامان صبوحی کے لئے تم کو
نماز صبح سے پہلے صراحی جام دھونا ہے

ان اشعار کے علاوہ ایک پوری غزل خمریہ اشعار پر مشتمل ہے سہ

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں

خزاں کی فصل ہو، روزے کے ایام مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں

طوافِ کعبہ بے کیفیت سے ہو نہیں سکتی
ملا لیتے ہیں تھوڑی سی اگر زمزم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ، کیسا اتقا عہد جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ تم بھی چکھو ہم بھی پیتے ہیں

کہاں تم، دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم، روبروئے ناصح برہم بھی پیتے ہیں

نشورؔ آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ریاضؔ خیرآبادی اور جگرؔ مرادآبادی کے علاوہ جس طرح نشورؔ واحدی نے خمریات کے موضوع پر اشعار کہے ہیں ان کے ہم عصر شعراء میں کسی نے نہیں کہے۔ حالانکہ نشورؔ واحدی نے زندگی میں شراب چکھی بھی نہیں تھی۔ نشورؔ واحدی کا جو رنگ ہے وہ اردو کے دوسرے شاعروں سے قطعاً مختلف ہے اور اس رنگ کے حسن و لطف میں جو انفرادیت ہے وہ آسانی سے محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن آسانی سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ نشورؔ کی شراب انگوری نہیں ہے بلکہ فارسی کے عظیم شاعر حافظؔ شیرازی کی طرح معرفت کی شراب ہے اور اسی شراب معرفت کے مفہوم میں نشورؔ واحدی نے صوفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن

"اس پاکبازی کی گواہی ان کی رندی سے ملتی ہے جو آلودگی سے مبرا ہے"[1]

اردو شاعری میں شباب اور حسن بھی خاص موضوع رہے ہیں۔ نشورؔ واحدی بھی حسن و شباب کے شیدائی ہیں۔ شباب اور جوانی کے بغیر حسن کا تصور ان کے یہاں نہیں پیدا ہوتا۔ جس حسن و شباب کا وہ تذکرہ کرتے ہیں اس سے عشق کرنا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ انھوں نے حسن کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس لطف اندوزی کی حدیں ہوسناکی سے نہیں ملتیں۔ بلکہ وہ اس کو انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی میں عورت اور اس کے حسن کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ ان کا محبوب وہی عورت ہے جو انسان کی لطیف ترین جنس ہے۔ اور جس کے دم سے زندگی میں رنگینی ہے۔ نشورؔ واحدی نے اپنی غزلوں میں انسانی زندگی کے اسی پہلو کی بھرپور ترجمانی کی ہے سہ

نگاہ چار ہوئی اور جھک گئیں نظریں
شباب مانع طرزِ کلام ہوتا ہے

پھینک مت اپنی جبینِ حسن سے
میری قسمت کا ستارا توڑ کر

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن، مقدمہ "سوادِ منزل" ص ۸

وہ حسن و عشق میں جب انتخاب ہوتا ہے
نگاہِ حشر قیامت شباب ہوتا ہے

وہ وقت اور بھی جانِ شباب ہوتا ہے
جب ایک مست ادا بے نقاب ہوتا ہے

اللہ رے حجاب ان کا، اللہ رے شباب ان کا
دنیا کا ہر اک جلوہ باطل نظر آتا ہے

ہے تو ممکن نگاہ سے پرہیز
ہاں مگر آپ کا شباب نہ ہو

وہ رنگ روپ، وہ نقشہ وہ خال کیا کہنا
شبابِ عمر کا حسن و جمال کیا کہنا

رنگ نکھرا ہوا بال بھیگے ہوئے
حسن چھایا ہوا حسن پر دیکھنا

ادھر نگاہ ادھر آہ اُف مرے اللہ
کوئی شباب نہ ہوتا کسی جوانی میں

نشورؔ واحدی کی شاعری کی ایک خصوصیت بے باکیٔ عشق بھی ہے

لکھنوی شاعری کے ہنگامی دور کو چھوڑ کر اردو میں عینی حسن پرستی نسبتاً کم اور کچھ لئے دیئے پن کے ساتھ دکھائی دیتی ہے حالانکہ اظہارِ عشق میں عاشق کے دل کی تڑپ بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ غالبؔ کی طرح نشورؔ بھی اس میدان میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے اور بے قراریٔ عشق کے اظہار کے ساتھ ہی حسن بینی بھی کھل کر کرتے ہیں۔ جگرؔ میں بھی یہ خصوصیت ہے لیکن نشورؔ ان سے آگے بڑھ جاتے ہیں ؎

یاد ہے ادا ناز فرما یاد ہے
پھینکنا پھولوں کی مالا توڑ کر

ہم شوخیٔ اندازِ جفا دیکھ رہے ہیں
ہاتھوں میں قیامت کی حنا دیکھ رہے ہیں

اس صاف منظر کشی کے ساتھ ہی نشورؔ نے غالبؔ کی طرح معشوق کے دل میں تلاطمِ عشق کے مظاہرے کا بھی پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے۔ اس معاملے میں بھی وہ جگرؔ سے دو قدم آگے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ اشعار دیکھئے ؎

کبھی عتاب کبھی اغفال کیا کہنا
نیاز و ناز کی دلکش مثال کیا کہنا

نظر نظر پہ مری مسکرائے جاتے ہیں
نظر جھکا کے نگاہیں ملائے جاتے ہیں

نشورؔ ان کے غرورِ حسن کا دامن پکڑ لوں میں
مگر میری کمندِ شوق پر الزام آتا ہے

(زلف کو توڑا کیوں کر جا سکتا ہے؟)

گھٹاؤں میں بہار آرزو جب تم نہیں ہوتے
بلائے غم بہ گل بانگ پپیہا بڑھتی جاتی ہے

("گل بانگ پپیہا" کی ترکیب کے علاوہ محبوب کا گھٹاؤں میں ہونا دیکھئے۔ یہ ابہام قائم رہتا ہے کہ محبوب کو بجلی مانا ہے یا "گھٹاؤں میں" کا مطلب "موسم باراں" ہے)

میں کیا کہوں کہ میں تو سراپائے عشق ہوں
حکمت بھی اس مقام میں خاموش ہو گئی

("سراپا عشق" کی جگہ "سراپائے عشق" اور "مقام پر" کے بجائے "مقام میں"۔ لیکن یہ کاتب کا تصرف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے "سراپا ہی عشق" کو "سراپائے عشق" کر دینا کچھ مشکل نہیں ہے)

چاند لطف دیتا ہے چاندنی کے ہالے میں
حسن پھوٹ پڑتا ہے رات کے اجالے میں

("چاندنی کا ہالہ" یا "چاند کا ہالہ"؟)

اس خالص جذباتی اور جمالی شاعری کے دور میں بھی نشور میں کہیں کہیں وہ آفاقیت اور اشاریت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو بعد میں کلام نشور کی خصوصیت بن گئی۔ کچھ مثالیں پیش ہیں ؎

رتبۂ شہید شوق کا یا التہاب شوق
جو کچھ بھی پوچھنا ہو سر دار پوچھنا

مرغ سحر بھی واقف اسرار تھا مگر
بازی قمار عشق میں پروانہ لے گیا

آج ساقی نے یہاں ختم تقاضا کر دیا
مڑ کے دیکھا اور پیمانوں کو صہبا کر دیا

کس بے بسی کے ساتھ بسر کر رہا ہے عمر
انسان مشت خاک کا احساں لئے ہوئے

خراب میکدہ ہر دم نئی دنیا میں ہے واعظ
مگر تو ہے کہ بیٹھا ہے وہی دونوں جہاں لے کر

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے دور کی شاعری کے مطالعہ سے نشور واحدی کی ذہنی کاوشوں، اور شاعرانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عصر حاضر کے بدلتے ہوئے حالات اور فکر کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ ان کا لہجہ شائستہ اور گمبھیر ہے ان کی غزلوں کا انداز گہرا اور پختہ ہے۔ انھوں نے زمانے کے تجربات اور ماحول کے اثرات بھی قبول کئے ہیں اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب نے صحیح لکھا ہے۔

"ان کی شاعری میں الفاظ کی نفاست بیان کی لطافت، خیالات کی بلندی و ندرت، جذبات

کی پاکیزگی، معتدل، شوخی و رنگینی جوش و سرمستی کے
خوشگوار نمونے موجود ہیں۔[1]

۳

دوسرے دور (آتش و نم) کا کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نشورؔ اردو غزل کے کتنے مراحل طے کر کے کس بلندی پر پہنچ گئے تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غزل ان کی جزو زندگی ہو کر رہ گئی ہو اور وہ اپنے محبوب کی ہر ہر ادا پر سو جان سے قربان ہو رہے ہوں، جس میں وصال کے علاوہ ہجر کی تلخیاں بھی ہیں۔ مگر ان موضوعات کا اظہار جس انداز میں نشورؔ صاحب نے کیا ہے اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ انھوں نے نہ کسی کی پیروی کی اور نہ پرانی لکیر پیٹی، ان پر جو گزری اس کا انھوں نے اپنے مخصوص لہجے اور منفرد انداز میں اظہار کر دیا۔ نشورؔ واحدی حسن کے شیدائی ہیں، حسن ان کو ہر حال میں متاثر کرتا ہے یہ حسن کہیں بھی ہو وہ اس کو دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی نگاہیں اس کی متلاشی رہتی ہیں، اس کا مشاہدہ ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اس سے تاثر قبول کرنا ان کی طبیعت کا جزو ہے۔ اس حسن کا کمال انھیں صنف لطیف میں نظر آتا ہے۔ وہ اسے عورت کی ذات میں مجسم دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں صنف لطیف کے حسن کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے وہ اس کے ایک ایک پہلو کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آغاز محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی الھڑ کا آنچل سرکا جائے ڈھلکا جائے

---

[1] شاہ معین الدین ندوی، صہبائے ہند (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۸۹ء ص ۸۳-۸۴

نہیں معلوم دل کھو کر پھر اپنا حشر کیا ہوگا
جہاں تک دل ہے ان کی مہربانی ہوتی جاتی ہے

تجھے دیکھوں کہ تیرے التفاتِ نرم کو سمجھوں
محبت بھی ترے جلووں میں پہچانی نہیں جاتی

چاند ہے اور چاندنی حسن ہے اور حسن یار
میرے ہزار دن نثار حسن کی ایک رات پر

فطرت جگا رہی ہے کمسن جوانیوں کو
سویا ہوا ہے محشر اک حسنِ بے خبر میں

مری حیات میں جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے بغیر بھی کیا خاک زندگانی ہے

وہ دوش وہ بازو وہ سرانگشت حنائی
جو چیز بھی سانچے ہی میں ڈھالی نظر آئی

بارگاہِ حسن میں جب کبھی نظر گئی
رک گئی، سنبھل گئی، تھم گئی، ٹھہر گئی

زندگی قریب ہے کس قدر جمال ہے
جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

بازو برہنہ، زلفِ مسلسل، بھویں سیاہ
آنکھوں میں کیف چال میں مستی شراب کی

نشورؔ واحدی کے یہاں حسن کا بیان شباب کے بغیر نہیں ملتا انھوں نے ان دونوں کو الگ نہیں کیا ہے، ان کی شاعری میں یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حسن کے ساتھ شباب اور شباب کے ساتھ حسن کا بیان ان کی غزلوں میں بہت نمایاں ہے۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنے آپ کو شاعرِ شباب بھی کہا ہے ؎

آیئے آیئے اس طرف وہ نشورؔ
شاعرِ یادگارِ شباب آگیا

اور اس میں شبہہ نہیں کہ شبابیات کا پہلوان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے شباب کی دلکش اور رنگین تصویریں کھینچی ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور موسیقیت نے ان کی کھینچی ہوئی حسن و شباب کی تصویروں میں ایک دلآویز رعنائی پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

حسن جو چودھویں برس آکے شباب سے ملا
جیسے کہ نغمۂ لطیف کیف شراب سے ملا

راز ہے کچھ گریز میں بات ہے کچھ بچاؤ میں
ان کے شباب کا پتہ ان کے حجاب سے ملا

نگاہِ شوق سے تا دیر حیرانی نہیں جاتی
شباب آیا تو ظالم شکل پہچانی نہیں جاتی

یہ زمیں بھی تھی یہ فلک بھی تھا مگر اک شباب کی تھی کمی
تری زلف تا بہ کمر گئی تو جہانِ حسن سنور گیا

دیکھتے ہی دیکھتے آگئیں جوانیاں
رس بھرا شباب میں زلف تا بہ کمر گئی

اک پیکرِ شباب کا خاموش التفات
ہونٹوں پہ جیسے مہر لگی تھی گلاب کی

اب کیا ہے ان کے حسن کی تخیل کے سوا
عالم تمام ان کی جوانی میں آگیا

میں نظر نظر پہ مچل گیا میں قدم قدم پہ ٹھہر گیا
تری کائناتِ شباب میں میں جوان ہو کے جدھر گیا

بہکے ہوئے شباب کی بے تابیاں تمام
کپڑوں کی سلوٹوں سے نمایاں سی ہو گئیں

سانچوں میں حسن و نور کے ڈھلتا گیا شباب
سرتاقدم شراب ہی ہوتا چلا گیا

نشورؔ واحدی کی شاعری شباب و حسن تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کی شاعری کا سرچشمہ غم حیات بھی ہے۔ وہ ایک دردمند دل بھی رکھتے ہیں۔ غم اور لوازمات غم کی ترجمانی ان کے بیشتر اشعار میں انتہائی خوبصورت اور متاثر کن انداز میں کی گئی ہے۔ لیکن وہ کہیں بھی فانیؔ کی طرح محض رونے بسورنے اور قنوطیت کی چادر اوڑھ کر دنیا سے بیزاری کا مظاہرہ نہیں کرتے انکے یہاں دھیما دھیما درد ہے اور ایک میٹھی میٹھی آنچ جو اظہار کی بے بضاعتی کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات کی بے ثباتی اور زمانہ کی ناموافقت کی وجہ سے ہے جو مسلسل تغیر کی زد میں رہتا ہے اور ہر چیز کو فنا کر دیتا ہے، ان کا احساس خودی بھی صداقت حسن کے تجربے سے عبارت ہے۔ جو انھیں ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں زندگی کی تلخ حقیقتیں ناسازگار حالات میں پروان چڑھتی ہیں۔ نشورؔ کا یہ احساس خودی ان کے کلام میں کبھی کبھی حزن و ملال کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ـــــ

آغوش مسرت میں جینا مشروط ہے غم میں مرنے پر
جو سو نہ سکے وہ کیا جاگے جو کھو نہ سکے وہ کیا پائے

ہزاروں عالم رنگیں کے بعد اک ساعت غم گیں
جو باقی ہے وہ میری عمر فانی ہوتی جاتی ہے

جس قدر آنسو گرے اتنا ہی انساں ہو سکا
زندگی شاید بقدر غم بنا سکتا ہوں میں

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں سوزش دل کا
بہت رویا مگر غم کی گراں جانی نہیں جاتی

غم زندگی ہے لیکن شاعر نشورؔ تیرا
نغموں سے کھیلتا ہے جب تک ہے زندگانی

غم یار و غم ہجر و غم آشفتہ سامانی
بہت غم کھا چکے اب کیا غم دنیا سے عار آئے

نشورؔ اب زندگی پیمائش غم کے سوا کیا ہے
شب رخصت اگر گزرے تو شام انتظار آئے

جیا لیکن مرا جینا کسی کے بھی نہ کام آیا
میں مرتا ہوں کہ شاید زندگی پیغام ہو جائے

دن بدل گئے مگر غم بدل سکا نہیں
دل رہا دل حزیں، چشم، چشم تر گئی

آغوشِ رنگ و بو کے فسانے میں کچھ نہیں
حسرت نکل گئی تو زمانے میں کچھ نہیں

نشورؔ کی غزلوں کی خصوصیت الفاظ کی نرمی، نغمگی، بیان کی سادگی اور نشتریت اور لب و لہجے کا آہنگ ہے، ان کو الفاظ کے در و بست کا بھی بہت خیال تھا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں دقیق الفاظ استعمال نہیں کئے بلکہ نرم و نازک اور شیریں الفاظ اپنی غزلوں میں استعمال کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے

دل ہے کہ نشورؔ اک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اٹھے جب ٹھیس لگے تھرا جائے

رخصت کے وہ آنسو وہ نگاہوں کی اداسی
تھی شام مگر صبح کے تارے نکل آئے

دل کے باجے میں نہیں معلوم کتنے تار ہیں
حسن کو اک تار کا نغمہ بنا سکتا ہوں میں

ہے اک زبانِ الفت ہر پیکرِ محبت
آنسو بھی ترجمانی، گیسو بھی ترجمانی

تم کیا گئے کہ جیسے دنیا بدل گئی ہے
سورج وہی ہے لیکن رونق نہیں سحر میں

تغیرات کے عالم میں زندگانی ہے
شباب فانی، نظر فانی، حسن فانی ہے

محبت بھی ظالم عجب بے بسی ہے
نہ وہ ہی ہمارے نہ دل ہی ہمارا

عشق غافل زخم کھاتا جائے گا
حسن کی تلوار چلتی جائے گی

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

دشمن نے مری راہ میں کانٹے بچھا دیے
اور میں اٹھا تو پھول ہی بوتا چلا گیا

دوسرے دور کی شاعری میں نشورؔ واحدی کے یہاں جمالیاتی شعور، نزاکت احساس، سادگی اور بے تکلفی، لہجے کی نرمی اور گرمی غرض یہ تمام زاویۂ جذبات اور احساسات ایک ساتھ تحلیل ہو کر شعری جامے میں نظر آتے ہیں۔ زندگی اور محبت کے حادثات اور ان کے ردعمل کی گونج یا صدائے بازگشت نشورؔ کے یہاں نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی کہسارِ غم میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور کبھی کبھی عصری مسائل کی ڈور سلجھانے میں محو نظر آتے ہیں۔ ان کی طبیعت جہاں ایک طرف گلشنِ فطرت کے غنچۂ نو دمیدہ کی نکہتوں سے معمور ہے

وہیں دوسری طرف سفرِ حیات کی صعوبتوں سے بھی وابستگی ہے وہ بات بات کی گہرائیوں سے واقف ہیں۔ بہرحال ان کے کلام میں غزل کی لطافت اور پاکیزگی نمایاں ہے۔ وہ غزل کے فن سے واقف ہی نہیں بلکہ اس پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔ ان کی اس دور کی غزلیں "خیال کی پستی اور بیان کی کمزوری سے یکسر پاک ہیں اور سنجیدہ تغزل کی اچھی مثالیں ہیں"[1]

۴

تیسرے دور (فروغِ جام) کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نشورؔ نے اس دور میں سیاسی اشعار خاصی تعداد میں کہے ہیں۔ نشورؔ واحدی شروع ہی سے وطن پرست رہے ہیں اور ابتدائی دور میں بھی نہ صرف ان کی نظموں میں وطن پرستی ظاہر ہوئی ہے بلکہ غزلوں میں بھی خالص ہندوستانی فضا نظر آتی ہے۔ ساون کے جھولوں اور اسی طرح کی دیگر مقامی تلمیحات کی جتنی جلوہ گری نشورؔ واحدی کے یہاں ملتی ہے اتنی ساغرؔ نظامی کو چھوڑ کر شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں ملے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی وطن پرستی کسی سیاسی پارٹی کے لائحہ عمل یا کسی خاص سیاسی فلسفہ کی چہار دیواری میں قید نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ ان کی غزلوں میں جو سیاسی اشاریت دکھائی دی ہے وہ عوامی قسم کی تنوطیت کی آئینہ دار نہیں ہے بلکہ ایک سلجھے ہوئے دماغ کے فرمودات ہیں جو خود کو سیاسی اتھل پتھل سے بالاتر سمجھتا ہے لیکن اس سے بے نیاز نہیں ہے۔ خود بھی فرمایا ہے ؎

سیاست ایک دورِ برق و باراں ؛ محبت ایک ذوقِ لایزالی

---

[1] فراق گورکھپوری۔ مقدمہ آتش و نم (دوسرا ایڈیشن) ص ۲۰

اسی بات کو ایک لطیف تر پیرائے میں یوں کہا ہے ؎

بزمِ خود کام تھی منتشر ہوگئی
شمع بے لوث جلتی تھی جلتی رہی

ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب تھا۔ ملک کی تقسیم کی بات چیت ہوئی۔ نتیجتاً خلوص و محبت کے معیار بھی بدلنے لگے، نظریں پھرنے لگیں، اپنے بیگانے ہو گئے اور نشورؔ جو صرف محبوب سے محبت کو زندگی کا ماحصل سمجھ بیٹھے تھے اس انقلاب سے چیخ اٹھے ؎

نشورؔ اب غزل ہے حیاتِ دوعالم
یہ عنوانِ زلف و کمر اک بہانہ

اس کے بعد جو خون خرابہ ہوا، اور ان لاکھوں جاں بازوں کے خون سے ہندوستان کی سرزمین سینچی گئی۔ جنھوں نے جنگِ آزادی میں قوموں کو مارچ کرنا سکھایا تھا تو شاعر کا دل ٹوٹ گیا اور زخموں نے رس رس کر ایسے اشعار کا روپ اختیار کر لیا جو اس دور کے کسی شاعر کے یہاں مشکل ہی سے ملے گا ؎

راستہ اس نے محبت کا جدا رکھا ہے
رہروِ شوق کو بھی آبلہ پا رکھا ہے

کتنے آزاد ہیں دنیا میں ترے اہلِ ستم
فیصلہ جیسے قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

میری پلکوں سے کوئی پوچھ لے تاریخ سرشک
کتنی آنکھوں میں یہ صہبا تھا گہر سے پہلے

لے تو ہے ایک مگر ہوتی ہے تقسیم کے بعد
ساغرِ شیخ و برہمن میں حرام اے ساقی

میکدہ آج سے ہے بزمِ عوام اے ساقی
ایک جام اور دے جمہور کے نام اے ساقی

یہ بجلیوں کا تھا کرم گل و بہار و باغ پر
کہ آشیاں پرست بھی چمن چمن پکار اُٹھے

ہر راستے کو لوٹ لیا اعتماد نے
رہزن بھی ایک شے ہے مگر راہبر کے بعد

یہیں کبودِ محبت کی بستیاں تھیں کبھی
بتا رہے ہیں یہ دیر و حرم کے ویرانے

پھولوں کے تبسم پر رونا ابھی آتا ہے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے ویراں چمنی پہلے

ہر راہ میں ہے گنج شہیدانِ انقلاب
وہ وقت ہے کہ سنگ اٹھاؤ تو سر ملے

نشورؔ واحدی نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ ہندوستان کے نیتاؤں اور حکمرانوں کی ایسی چٹکیاں لیں کہ وہ بلبلا اٹھے ؎

رندوں نے اگر توڑا پیمانہ تو کیا شکوہ
ساقی کی طرف سے بھی پیماں شکنی پہلے

ساقی بھی حریفوں کو پہچان کے دیتا ہے
جب بزم سے ہم نکلے تب دور میں جام آیا

فریبِ مشرق و مغرب ہیں رہبرانِ جدید
یہ بدنصیب نہ عاقل ہوئے نہ دیوانے

جل رہا ہے کس جگہ شامِ غریباں کا لہو
دور تک پھیلی ہوئی اک روشنی پاتا ہوں میں

تارکِ رسمِ جفا بھی اب ستم ڈھانے لگے
لیجئے اتری کمانوں سے بھی تیر آنے لگے

اپنی کمزوری بیاں کرتا ہے ہر دانش فروش
حضرتِ ناصح نہیں سمجھے تو سمجھانے لگے

ابتدا سے جو پلے تھے موج طوفاں خیز میں
جب وہی کشتی میں آ بیٹھے تو چکرانے لگے

اور پھر حکومتِ وقت سے یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں ہی کی مسلسل جدوجہد و قربانی کے سبب ہندو قوم گہری نیند سے جاگی اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے قابل ہوئی۔ ذیل کی مسلسل غزل میں ان کا بے باکانہ انداز اور طنطنہ دیکھتے ہی بنتا ہے ؎

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

صد شکر کہ ہے ان کا تبسم بھی ہمیں پر
کلیوں میں جنھیں غنچہ دہن ہم نے بنایا

اغیار کی گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ہر جذبۂ آزادیٔ فطرت کو ہوا دی
ہر بادۂ پیمانہ شکن ہم نے بنایا

ڈرتے ہیں خوشی سے ہماری مہ و انجم
چپ رہ کے وہ انداز سخن ہم نے بنایا

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

مستقبلِ تہذیب کا نغمہ ہمیں ٹھہرا
جو "زمزمۂ گنگ و جمن" ہم نے بنایا

اس مسلسل غزل میں جنگِ آزادی کی پوری تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ جس میں حافظ رحمت خاں، بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، عظمت اللہ خاں، سید احمد شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی، نانا فرنویس، جھانسی کی رانی اور ایسے ہی بے شمار مجاہدین کے مرقعے پوشیدہ ہیں۔

نشور واحدی تقسیم ملک کے خلاف تھے۔ انھیں ہندوستان و پاکستان کے بٹوارے سے دلی تکلیف ہوئی۔ وہ بڑے ہی غمگین اور دکھی لہجے میں کہتے ہیں ؎

کچھ سوچ کے اک راہِ پرخار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

پھیکا پھیکا سا ہے تبسمِ گل
جیسے کھل کر بہار شرمائی

مصلحت ہے کہ ترا تیر نہ خالی جائے
ورنہ مٹھی میں ارادوں کی کماں رکھتا ہوں

غیر کے ہاتھ میں آزادیٔ روشن کا چراغ
میں فقط مردہ چراغوں کا دھواں رکھتا ہوں

تیری بخشی ہوئی آزادیِ جبیں کی سوگند
ایک سجدہ بھی غلامی میں گراں رکھتا ہوں

نشور واحدی کے یہاں جنگِ آزادی کے نغمے ہی نہیں ملتے بلکہ حسن و عشق کے تذکرے بھی ہیں۔ وہ حسن اور عشق دونوں کا احترام کرتے ہیں اور دونوں

کے حقوق کو مانتے ہیں ؎

حسن اک ناتمام سا اقدام
عشق اک کامیاب پسپائی

عشق نے جب کوئی عالم میں فسانہ لکھا
ابتدا کی تو تری زلف دکمر سے پہلے

مٹی سے کرن تک ہے اک عشق کی تابانی
کس حسن کا جادو ہے شبنم سے شبستاں تک

طور کچھ نہیں لیکن منکر تجلی حسن
عشق ہے تو مستی ہے حسن ہے تو ہستی ہے

نشورؔ واحدی حسن کا بڑا لطیف اور ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ اس کی عشوہ طرازیوں میں کھو گئے ہیں جس حسن کا تذکرہ ان کی غزلوں میں ملتا ہے وہ بڑے ہی مہذب ماحول کی پیداوار ہے۔ ان کے کلام میں اس موضوع پر بعض اعلیٰ درجے کے اشعار مل جاتے ہیں۔ جن میں خود ان کا رنگ و آہنگ نمایاں ہے ؎

ان کا جلوہ نہ دور ہے نہ قریب
نور ہے، کم زیادہ ہوتا ہے

نگاہ حاصل رعنائی دو عالم ہے
وصال اگر نہیں ممکن نظارہ کیا کم ہے

کہیں کلی نے تبسم کا راز سمجھا ہے
جو خود چمن ہے وہ اپنی بہار کیا جانے

ان مست نگاہوں کے فتنے کا یقیں کر لو
یا ساتھ چلو میرے اس آئینہ ساماں تک

معشوق ہے آئینہ طلب کرے تو کیا دور
دوشیزہ ہے انداز بہک جائے تو کیا ہو

میں آ گیا سکوت و تبسم کے درمیاں
وہ مسکرا دیے سخن مختصر کے بعد

انھیں محبوب کی ہر ادا پسند ہے وہ جفائے یار کو بھی وفا ہی سے تعبیر کرتے ہیں اور شکوے کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

امتحان شوق ہے دل کی عاشقی نشورؔ
دل کا کوئی حال ہو ان کو دلربا کہوں

مطلب ہی محبت کا ہر ایک جدا سمجھا
میں مہر و وفا سمجھا وہ جور و جفا سمجھا

نشور نے جدائی کی گھڑیاں بھی گزاری ہیں۔ ہجر کی طویل راتوں سے انھیں سابقہ بھی پڑا ہے۔ ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سب کچھ جھیلا مگر اپنی محبت اور محبوب پر آنچ نہ آنے دی ؎

کیوں سکوں نصیب ہیں ہجر کی درازیاں
جیسے پیاس بجھ گئی، جیسے بھوک مر گئی

شام غم اور طال تنہائی
بڑی مشکل سے رات نیند آئی

گذشتہ الفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے

نشور کے یہاں زمانے کے غم کا احساس بھی ہے۔ کیونکہ زمانے کا غم انھیں گھیرے رہتا ہے۔ وہ زندگی کی تابناکیوں کو دیکھتے وقت اس کی تاریکیوں کو فراموش نہیں کرتے۔ زندگی کی انجمن آرائیوں کا نظارہ کرتے وقت آدمی کی عصری تنہائی سے غافل نہیں ہو پاتے۔ فطرت کے حسین مناظر دیکھتے وقت انسان کے دکھ کو بھول نہیں پاتے۔ ان کی بصیرت آبادی میں چھپے ہوئے ویرانے، فتح میں ملی ہوئی شکست اور تہذیب کے عروج میں انسانی اقدار کو دیکھنے سے باز نہیں آتی ؎

شاید کہ نظر پہنچے تیری غم انساں تک
اے صبح چمن پر در چل شام غریباں تک

زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالم صد تنہائی ہے

نئی دنیا مجسم دلکشی معلوم ہوتی ہے
مگر اس حسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے

کاٹتی ہے تنہائی آرزو کے لمحوں میں
ناگ جیسے پالے ہیں رات جیسے ڈستی ہے

جسے غم سے کچھ ملا ہے یہی نفس ہے میرا
جو شکستہ ساز دل ہو تو سنو میرا ترنم

اے کم نصیب لذت آلام روزگار
غم اس لئے دیا کہ تجھے غم نہ ہو سکے

پھولوں کے تبسم پر رونا ابھی آتا ہے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے ویران چمن پہلے

غم والم کے علاوہ نشور کی اس دور کی شاعری میں جو لطافت ملتی ہے وہ اس سے پہلے اتنی واضح نہیں تھی ؎

اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

کہیں کلی نے تبسم کا راز سمجھا ہے
جو خود چمن ہو وہ اپنی بہار کیا جانے

وہ ایک قطرہ جو آنکھوں کا رنگ لے کے گرے
ہزار عالم رنگیں کا ایک عالم ہے

دنیا کو خبر کیا کہ کسی سادہ ادا نے
اشکِ پسِ مژگاں سے بدل ڈالے زمانے

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دیے تو التفات کہتے ہیں

چمن چمن ہے محبت جہاں جہاں ہے جمال
یہ اہتمام ہے اک دل کی زندگی کے لئے

ہو لئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

اک آہ جو شعلہ بار ہوئی عالم میں شرارے پھیل گئے
اک موج جو مضطر ہو کے اٹھی دریا کا لہو گرما ہی گئی

اس لطافتِ احساس کے ساتھ مشاہداتِ زندگی نے ہم آہنگ ہو کر نشور کے اشعار کو عجب ضیا بخش دی ہے جس میں استعارات و کنایات کی انفرادی شان بھی درخشاں ہے۔ کچھ اشعار پیش ہیں ؎

یوں حسن کے چہرے پر آتی نہیں برنائی
سو شام کے پردوں میں اک صبح جلی پہلے

پھیکا پھیکا سا ہے تبسم گل
جیسے کھل کر بہار پچھتائی

زندگی پرچھائیاں اپنی لئے
آئینوں کے درمیاں سے آئی ہے

بہت خفیف ہے کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا

بہکے ہوئے قدم سے خراماں ہے زندگی
ہستی تمام لغزشِ پائے ثبات ہے

نہ زاہدوں کے وعظِ ترکِ عشق پر ہنسے کوئی
یہ بے خبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

سمجھو تو یہ بھی تنگیِ چشمِ بہار ہے
شبنم کو زندگی کی کرن ناگوار ہے

اس دور کی شاعری میں نشور واحدی اپنے تمام تر شعری محاسن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ نشور واحدی کی اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے :۔

"ان کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے، غمِ دوراں بھی ہے، حسن کی مصوری بھی ہے اور حالاتِ حاضرہ کی عکاسی بھی۔ عشق کے معاملات بھی ہیں اور مصافِ زیست کی واردات بھی، وہ نئے دور کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں اور ماضی کی بعض لذتوں اور لطافتوں کو یاد بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات میں تجربے ہیں اور روایات کا احساس بھی۔ ان کے کلام میں اس دور کا درد و کرب بھی ہے اور اس کا نشاط و نغمہ بھی۔ ان کے چمن میں ہر رنگ کے پھول اور ان کے شیشے میں ہر طرح کی شراب ہے۔ اپنے طور پر انھوں نے بھی ہمارے دور کی روح کی نمائندگی کی ہے"[۱]

۵

چوتھے دور کی (سوادِ منزل، گل افشانیٔ گفتار اور غیر مطبوعہ کلام) کی شاعری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ نشور واحدی کے شعور میں پچھلے ادوار میں وہ گہرائی اور گیرائی نہ تھی جو چوتھے دور میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب کے آخری دور میں ان کی خصوصیت سلاست، سادگی اور پرکاری ہے۔ نشور کے یہاں غالب جیسی سلاست نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے

اشعار میں غالب جیسی آفاقیت اور زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ فکر و نظر کی گہرائی اور احساس کی پختگی نے لہجے میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے اور عمیق تر احساسات کو مزے میں ہلکے پھلکے ڈھنگ سے کہنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔

حسن و عشق کا بیان اردو شاعری میں کچھ نیا نہیں ہے اردو کے ہر شاعر نے اس میدان میں زور آزمائی کی ہے لیکن کامیاب وہی ہوا ہے جس نے اپنے سوزِ عشق کو تاثرات و واردات کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ نشور واحدی نے بھی اردو غزل کو اپنا ایک مخصوص اور منفرد نظریۂ حسن و عشق دیا ہے۔ انھوں نے عشق کو خودداری سکھائی اور حسن کی عظمت و احترام کا بھی پورا پورا خیال کیا۔ ان کی شاعری محبت کی کیفیات و واردات کی بہترین ترجمانی ہے ان کے یہاں وہ تمام خیالات موجود ہیں جن سے ذہن عشق کی حقیقتوں کی آماجگاہ، تصورات کا مسکن اور نازک احساسات کا مترجم بنتا ہے۔ اس طرح وہ حسن و عشق کی لطافت و نزاکت اور اس کے رنگ و آہنگ سے مسرور اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق لازم و ملزوم ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پیش کر داغ اگر دل پہ کوئی کھایا ہو
عشق ہر عاشقِ صادق سے نشانی مانگے

حسن ہر گام پر قائم کرے اک تازہ حجاب
عشق پردے کی یہ دیوار گرانی مانگے

حسن اگر ہے اس طرف محوِ نازِ دلبری
عشق کے مزاج میں بانکپن ادھر بھی ہے

حسن کو عشق کے انداز سکھائے نہ بنے
آخرِ شب کوئی روٹھے تو منائے نہ بنے

عشق ہے جلتے دلوں کا کارواں
کچھ نہ یاد آیا تری یادوں کے بعد

عشق کی طبیعت میں سادہ پن سا ہوتا ہے
ہر ستم کے آخر میں حسنِ ظن سا ہوتا ہے

عشق اک کارواں آگاہی ہے
حسن اک بے خبر لٹیرا ہے

حسن خود بین و عشق خود رفتہ
جگمگاتی آنکھوں کا خواب ہیں دونوں

یہ حسن بھی اک آگ ہے اور عشق بھی اک آگ
انگاروں میں شعلوں پہ نظر کرتے رہے ہیں

بہارِ حسن سے کتنے گلاب کھلتے ہیں
چمن میں عشق کے دیکھا کہیں نہ پیڑ نہ پات

نشورؔ نے اپنی شاعری کا بڑا حصہ محبوب کی پیکر تراشی کی نذر کیا ہے۔ اسی لئے یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری عشق سے زیادہ حسن کی شاعری ہے اور نشورؔ کے یہاں حسن سے مراد محبوب کی وہ ظاہری خوبیاں ہیں جن سے نشورؔ کی فکر و نظر یا احساس متاثر ہوتا ہے۔ اور قلب و نظر کو یک گونہ تسکین ملتی ہے۔ بنیادی طور پر نشورؔ حسن کے گرویدہ اور پرستار ہیں۔ محبوب کے خط و خال اور چال ڈھال، رنگ و روپ، آواز و رفتار، قد و گیسو نشورؔ کی غزلوں کا خاص موضوع ہیں۔

اردو عشقیہ شاعری کی یہ روایت رہی ہے کہ عشق کی ساری کلفتیں اور مصائب عاشق کے سر اور عشق کی ساری عشرتیں محبوب کے حصے میں آتی ہیں اور غزل کا عاشق معصوم، سادہ دل اور باوفا ہے جو محبوب کا ہر ظلم و جور برداشت کرتا رہتا ہے مگر اس سے دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ ہاں اس کا گلہ شکوہ برسرِ عام ضرور کرتا ہے۔ دوسری طرف غزل کا محبوب وہ جفا پیشہ محبوب ہے جو عاشق کے قتل کے درپے رہتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی سرشت میں وفا نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ غزل میں عاشق اور معشوق کی جو تصویر بنتی ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ محبوب وہ خنجر بکف معشوق ہے جس کے سامنے عاشق اپنے گردن جھکائے قتل ہونے کا منتظر ہے۔ یہ منظر اردو غزل کے افق پر چھایا ہوا تھا یا ہے۔ لیکن حالیؔ کی جرأت مندانہ کوششوں اور کچھ ترقی پسند شعرا کی دیرینہ روایات سے انحراف نے اس روایتی محبوب سے روایتی عاشق کا پیچھا چھڑایا۔ لیکن پھر بھی اردو غزل میں روایتی محبوب کا رنگ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ تغیر و تبدل

کی کئی بسیار اور ترقی پسند شعراء کی بیہم یلغار کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں غزل میں موجود ضرور رہا۔ کچھ شعراء کے یہاں وہی فرسودہ تصور آج بھی موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نئے انداز بیان نے محبوب کو نیا لباس پہنا دیا۔ نشورؔ کا محبوب بھی روایتی محبوب ہے لیکن نشورؔ نے اسے ایک نئے انداز کے ساتھ غزل میں پیش کیا ہے ؎

حسن بے حجاب پر ایک پردہ ڈال لو
تم اسے صنم کہو میں اسے خدا کہوں

معلوم نہیں پھول ہیں یا نقشِ کفِ پا
گزرا ہے کوئی راہ چمن جاگ پڑی ہے

شور سن کر مری رسوائی کا
وہ بھی چلمن کے قریب آ پہنچے

ہم ان کو بلائیں کیوں اچھا ہیں خفا ہیں وہ
آئیں تو قیامت ہے جائیں تو قیامت ہے

رہبر منزلِ خرد ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی آنکھ سے پیار چھوٹ جائے

ہزار بار خزاں آئی اور گئی ناکام
بہار تیرے تبسم نے روک رکھی ہے

محبت ساتھ چلتی ہے تو راہیں جگمگاتی ہیں
قدم رکھتا ہوں میں دیپک جلاتے جا رہے ہیں وہ

معطر سی ہیں گلشن کی فضائیں
سنا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں

وہ ایک تبسم میں چھپائے گئے سب کچھ
نالے مرے ان پر بھی اثر کرتے رہے ہیں

نشورؔ مست نگاہوں کا راز کیا کہیے
ان انکھڑیوں نے کسی کی غزل چرائی ہے

حسن و عشق کے ساتھ ساتھ نشورؔ کے یہاں غم زندگی کے نغمے بھی ہیں چونکہ انسانی زندگی میں غم کا عنصر موجود ہے جو ترقی کر کے وجدیا موجودات کی ایک صفت بن جاتا ہے جو حقیقت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یہی آفاقی احساس غم نشورؔ کے یہاں ملتا ہے۔ نشورؔ، فانیؔ کی طرح مایوسیوں اور ناکامیوں کا علاج موت نہیں سمجھتے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ نشورؔ اس دنیا میں رہ کر جینا چاہتے ہیں اور زندگی کو خوبصورت بنانے کے درپے ہیں کوئی بھی درد ہو اس میں وہ مرنا قبول نہیں کرتے۔ نشورؔ کے یہاں ایک سنجیدگی ہے جو

زندگی اور اس کے مسائل سے الجھنے اور سوچنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ان کے شاعری میں اندرونی سطح پر جو غم انگیزی محسوس ہوتی ہے۔ وہ روایتی غم انگیزی نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں جس اندرونی اضطراب و تشنگی کا احساس ہوتا ہے وہ زمانے کی دین ہے۔ اور کچھ ان کی ذاتی زندگی کی پریشانیاں، محرومیاں تشنگی، خواہشیں، آرزوئیں، زندگی کے نشیب و فراز ان کی شاعری میں منعکس ہوتے ہیں ایسا ہونا فطری بھی ہے کیونکہ کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنی ذات و شخصیت سے فرار حاصل نہیں کر سکتا چاہے وہ میرؔ ہوں، چاہے غالبؔ ہوں یا نشورؔ شاعر کے غم میں زمانے کا غم بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ جس دور میں جیتا ہے اس دور کے تقاضے، کرب و انتشار کی کیفیت بھی اس کے اشعار میں ڈھل جاتی ہے۔ غزل کے اس المیہ مزاج کے سلسلے میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔

نشورؔ کا المیہ مزاج اپنے عہد کے سکھ دکھ کے اشتراک سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں کے توسط سے صرف اپنا ہی غم بیان نہیں کرتے بلکہ زمانے کے سکھ دکھ کا بیان بھی کرتے ہیں ؎

آدمی عہد جوانی میں رہا منکرِ غم
اب غم دل کی خبر ہے تو جوانی مانگے

نشورؔ اشعار میں شاید ہمیں پہچان لے کوئی
جو انہوں سے نہ کہہ پائے وہ بیگانوں سے کہنا ہے

غم بھی کھانا کوئی چاہے تو نہ ممکن ہوگا
آدمی دہر میں بھوکا ہی رہے گا کچھ دن

شاعر کو نشورؔ آخر فرصت نہ ملی غم سے
یا زلف پریشاں تھی یا فکر پریشاں ہے

مجھ کو فکر شعر سے کچھ ملا نہیں مگر
غم زدہ تھا دل نشورؔ شعر میں بہل گیا

شب غم مری شب غم سر شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانا نہ کہیں مرا ٹھکانا

ہے نشورؔ دنیا میں اہل فن کی پامالی
کون بات پوچھے ہے ہم سے خستہ حالوں کی

کچھ اس قدر جہاں میں مصائب کا تھا ہجوم
میں زندگی سے مل نہ سکا زندگی میں بھی

بڑا انعام ہے اے دوست غم بھی
کسے ملتا ہے، دنیا مانگتی ہے

مجروح غم دوراں فریاد کرے کس سے
زخمی ہے جہاں دنیا خنجر ہے نہ قاتل ہے

نشورؔ کی اس دور کی شاعری میں فلسفہ اور تصوف بھی بڑی رچی ہوئی صورت

میں ملتا ہے۔ چونکہ نشور واحدی صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی زندگی پر اس کے اثرات بھی پڑے۔ اس لئے انھوں نے اپنی غزلوں میں صرف تصوف کے روایتی تصور کو پیش نظر نہیں رکھا ہے بلکہ اس سلسلے میں نئی باتیں بھی کہی ہیں ؎

کس کس کو سلام کرے کوئی
خالق ہی کی بندگی بہت ہے

ہر قطرہ کا ہے حساب دینا
ساقی کی نظر کڑی بہت ہے

کچھ اور مانگ خدا سے کہ زندگی ہے وہاں
حیات کی تری دنیا میں کچھ کمی بھی نہیں

پتے پتے کا نہیں گلشن عالم میں جواب
ذرہ ذرہ میں دھڑکتا ہے دل یکتائی

وفا سے پہلو بچانے والے ملے بریشم کے بستروں میں
وہیں پہ حق بات کہنے والا قریب دار و رسن ملا ہے

یہ توبہ اور توبہ کی نمائش
غرور بندگی ہے۔ بندگی کم

تو لئے اوج وفا بھی اک ابتدائے سفر
مقام دار و رسن اولیں قدم ہے یہاں

آدمی بستۂ زنجیر تعلق ہے نشور
زندگی نام ہے تسلیم و رضا ہے یہ بھی

اس دور کی شاعری میں نشور کے یہاں استعارات، کنایات اور تمثیلوں کی انفرادیت پہلے سے بڑھ گئی ہے، جو چونکانے والی نہیں بلکہ گدگدانے والی ہے۔ نشور جب تشبیہوں پر آتے ہیں تو ان کا ڈھیر لگا دیتے ہیں جیسے ایک غزل کے تین اشعار ؎

ان کے خرام ناز کے آگے تھم سی گئی ہے گردش عالم
زلف حسیں نے نور جبیں نے شام و سحر کو روک لیا ہے
پی کے بہکنا کوئی نہیں ہے فکر نگوں کا نام ہے مستی
شیشۂ مے نے قافلہ ہائے فکر و نظر کو روک لیا ہے
تم نے بنائے لاکھوں شیشے عکس کسی میں بھی نہیں ٹھہرا
دل نے بنا کر آئینۂ غم آئینہ گر کو روک لیا ہے

نشور کی اس دور کی شاعری میں ایسے بھی اشعار مل جاتے ہیں جن میں سادگی کے ساتھ فکر و نظر کی وسعت اور عمق دیدنی ہے ؎

سو اس کی تجلی بھی ہے محو سفر شاید
آئینہ بہ آئینہ یکتائی بہ یکتائی

انجام وفا یہ ہے جس نے بھی محبت میں
مرنے کی دعا مانگی جینے کی سزا پائی

اس آفاقیت کا مطلب یہ نہیں کہ نشورؔ کا شعور سماج اور اس کے مسائل سے کنارہ کش ہو چکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اب وہ ان مسائل پر تیز طنز نہیں کرتے بلکہ نرم لہجے میں اپنی بات کہتے ہیں جو الفاظ کی کڑک دمک نہ ہونے پر بھی پُر اثر اور دیر پا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

رہبرِ منزلِ خرد ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی آنکھ سے پیار چھوٹ جائے

کتنی افسردہ و بے کیف ہے صہبائے خودی
پھونک دے جام سے ساقی کہ دوا ہے یہ بھی

لالہ و گل میں بھی تجھ کو مسکرانا ہے مگر
ہر چمن میں مسکرا کر غم کے ماروں کو نہ چھیڑ

پھر دیدۂ پرنم پر مائل یہ تبسم ہیں
پروردۂ گلشن ہیں کلیوں کی سی عادت ہے

یہ توبہ اور توبہ کی نمائش
غرورِ بندگی ہے بندگی کم

[illegible]

بلکہ دریا کا بہاؤ ہے جس میں روانی کے ساتھ عمق اور عرض بھی بڑھتا جاتا ہے۔ حقیقی شاعری اسی کو کہتے ہیں یہ بات کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتی کہ نشورؔ کی شاعری کی قدر زمانے نے خاطر خواہ کی یا نہیں۔ زمانہ بے چارے کو اپنی ہی پریشانیوں سے فرصت نہیں۔ زمانے کی شکایت ایک فرسودہ شیوہ ہے۔ نشور خود اس پر طنز کرتے ہیں ؎

نقاد سے دلبر سے احباب سے دنیا سے
شاعر کو نشورؔ آخر کس کس سے شکایت ہے

حاصلِ زیست بجز دردِ طلب کیا ہے نشورؔ
زندگی سے کتنے فنکار نے پایا کیا ہے

ہے نشورؔ دنیا میں اہلِ فن کی پامالی
کون بات پوچھے ہے ہم سے خستہ حالوں کی

شعر ہے سرمایۂ دنیا ہے بے معنی نشورؔ
شاعرانِ محترم بھی آج ہیں بے احترام

لیکن اہلِ نظر کے نزدیک ہر نظریہ سے نشورؔ کی شاعری اردو کا ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوگی۔ ان کی شاعری کی توصیف میں اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا جو انھوں نے خود کہا ہے اور بالکل صحیح کہا ہے ؎

اپنا نشورؔ انداز جدا ہے فکرِ حسیں سے آہِ رسا تک ؎ میں نے فضائے لالہ و گل میں برق و شرر کو روک لیا ہے

باب پنجم

نشورؔ واحدی کی نظم نگاری

بنیادی طور پر نشورؔ واحدی غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شعری زندگی کا آغاز غزل ہی سے کیا ہے اور آخر عمر تک ان کی پسندیدہ صنف سخن غزل ہی تھی۔ ویسے نشورؔ کی نظموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ مگر نشورؔ نے اس زمانے میں بھی جب نظم گوئی اپنے شباب پر تھی اور غزل سے بے اعتنائی عام تھی غزل سے گریز نہیں کیا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نشورؔ نظم گوئی کی اس تیز لہر میں نہیں بہے یا متاثر نہیں ہوئے۔ نشورؔ نے بھی نظمیں کہیں اور وہ نظمیں ایسی نہیں جو ان کی قدرت کلام، ان کی خلاقی کے جواہر اور فکر کی انتھک پرواز کا پتہ دیتی ہیں۔ اور ادب العالیہ میں ایک مقام رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود نشورؔ اردو دنیا میں بحیثیت غزل گو کے زیادہ متعارف ہیں۔

نشورؔ کی نظم نگاری کے سلسلے میں یہ دیکھا جائے گا کہ نشورؔ کی نظمیہ شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان کے یہاں تجربے ہیں کہ نہیں، اور اگر ہیں تو کس نوعیت کے ہیں؟ کیا وہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں یا وہ تجربے بھی ویسے ہی ہیں جو اس عہد میں عام تھے۔ فکری اور معنوی توسیع کے لحاظ سے ان نظموں کی قدر و قیمت کیا ہے۔ انھوں نے اردو نظم نگاری کی روایت میں کسی قسم کا اضافہ کیا ہے یا نہیں۔ یا ان کی نظمیں فنی اور فکری اعتبار سے کس مرتبے کی ہیں؟

فارم یا ہیئت کی حد تک تو نشورؔ کے یہاں کوئی ایسا بڑا کارنامہ یا تجربہ نظر نہیں آتا جسے اردو نظم کی روایت میں اضافے کا نام دیا جائے یا جو اردو نظم کے

تاریخ میں بالکل تنہا رہا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ ان کی نظمیں بالکل روایتی قسم کی ہیں۔ ان کی اکثر نظموں کا لب و لہجہ اور موضوع نیا ہے۔

نشورؔ نے آزاد نظموں کے تجربوں اور اس کے فارم کو برتنے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ لیکن انھیں نظم کا بڑا شاعر مان لینا اور انھیں دوسروں سے منفرد اور ممتاز قرار دینا قطعی غلط ہوگا۔ ہاں ان کی نظموں کے سلسلے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نشور نے نہ صرف اس روایت کا احترام کیا بلکہ اس رجحان کو آگے بڑھانے اور فروغ دینے کی شعوری کوشش بھی کی۔ دراصل نشورؔ کی شاعری کا وقار بہت کچھ اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے دور کے تقاضوں سے وابستہ رکھا، انھوں نے زندگی کے تقاضوں کو سمجھا، چاہے وہ ذاتی رہے ہوں یا سماجی، انھیں تقاضوں کو انھوں نے پیکر عطا کیا۔

نشورؔ نے نئے رجحان کو پرکھا سمجھا اور قبول کیا ہے۔ انھوں نے ہر صحت مند تحریک میں حصہ لیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا جز قرار دیا ہے چاہے ذہنی طور پر ہی۔ سماج اور وقت کی بدلتی ہوئی قدروں کو شاعری کی قدریں قرار دیا ہے، ان کی شاعری اپنے عہد اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہی ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی نہ صرف اردو ادب کے لئے، بلکہ سارے ہندوستان کے لئے قومی اور تہذیبی شعور کی صدی تھی۔ اس صدی میں جتنی تبدیلیاں ہندوستان میں ہوئیں، چاہے وہ تہذیبی سطح پر ہوئی ہوں یا سماجی اور سیاسی سطح پر، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ پرانی قدریں بے رحم حقیقتوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس عہد میں پاش پاش ہوئیں۔ نئے قومی اور تہذیبی شعور نے جنم لیا۔ ظاہر ہے کوئی شاعر یا ادیب ان تبدیلیوں سے اپنے آپ کو یکسر الگ نہیں رکھ سکتا اور نہ رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنے آپ کو یا اپنے فن کو سماج کی شکست و ریخت کو اپنے فن کا حصہ نہیں بناتا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی شاعری یا فن ادب کا اعلیٰ نمونہ بن جائے مگر اسے عصری ادب قطعی نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ادیب و شاعر کا مطالعہ صرف کسی صنف کے ارتقا کے سلسلے میں تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے عہد کے پس منظر میں اس کا فن مصنوعی نظر آئے گا۔ نشورؔ کی کامیابی کا راز بہت کچھ اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے سماج اور تہذیب کی بدلتی ہوئی قدروں کو نہ صرف اپنی شاعری کی قدریں قرار دیا بلکہ اپنی شاعری میں برتا بھی۔

نشورؔ کے عہد میں نظم کے سب سے بڑے شاعر اور سب سے منفرد شاعر علامہ اقبال تھے ان کے علاوہ جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری بھی نظم گوئی میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے، اور اردو شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ماحول میں نشورؔ واحدی نے نظم نگاری شروع کی، شعوری اور غیر شعوری طور پر ان متذکرہ بالا شعرا سے وہ متاثر بھی ہوئے۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ خود فرماتے ہیں:-

> "جب مجھے قومی اور ملکی مسئلے پر شعر کہنا ہوتا تھا تو میں نظم کی طرف رجوع کرتا تھا کہ اقبال کی طرح پیغام دوں کہ وطن کیا ہے، وطن کی خدمت کیا ہے۔ ویسے میری نظموں میں، میں انکار نہیں کر سکتا کہ جوشؔ اور فراقؔ کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب میں رومانی نظمیں کہتا ہوں تو نظیر اکبر آبادی، جوشؔ اور فراقؔ تینوں سے ایک الگ رنگ میرے یہاں نکلتا ہے"[1]

نشورؔ واحدی کے مزاج اور ان کے شاعرانہ فن کو سمجھنے کے لئے ان کے

---

[1] نشورؔ واحدی سے کے۔ کے نیر کا انٹرویو مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۲ء

تاریخ میں بالکل تنہا رہا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ ان کی نظمیں بالکل روایتی قسم کی ہیں۔ ان کی اکثر نظموں کا لب و لہجہ اور موضوع نیا ہے۔

نشورؔ نے آزاد نظموں کے تجربوں اور اس کے فارم کو برتنے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ لیکن انھیں نظم کا بڑا شاعر مان لینا اور انھیں دوسروں سے منفرد اور ممتاز قرار دینا قطعی غلط ہوگا۔ ہاں ان کی نظموں کے سلسلے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نشورؔ نے نہ صرف اس روایت کا احترام کیا بلکہ اس رجحان کو آگے بڑھانے اور فروغ دینے کی شعوری کوشش بھی کی۔ دراصل نشورؔ کی شاعری کا وقار بہت کچھ اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے دور کے تقاضوں سے وابستہ رکھا، انھوں نے زندگی کے تقاضوں کو سمجھا، چاہے وہ ذاتی ہے ہوں یا سماجی، انھیں تقاضوں کو انھوں نے پیکر عطا کیا۔

نشورؔ نے نئے رجحان کو پرکھا سمجھا اور قبول کیا ہے۔ انھوں نے ہر صحت مند تحریک میں حصہ لیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا جز قرار دیا ہے چاہے ذہنی طور پر ہی۔ سماج اور وقت کی بدلتی ہوئی قدروں کو شاعری کی قدریں قرار دیا ہے، ان کی شاعری اپنے عہد اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہی ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی نہ صرف اردو ادب کے لئے، بلکہ سارے ہندوستان کے لئے قومی اور تہذیبی شعور کی صدی تھی۔ اس صدی میں جتنی تبدیلیاں ہندوستان میں ہوئیں، چاہے وہ تہذیبی سطح پر ہوئی ہوں یا سماجی اور سیاسی سطح پر، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ پرانی قدریں بے رحم حقیقتوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس عہد میں پاش پاش ہوئیں۔ نئے قومی اور تہذیبی شعور نے جنم لیا۔ ظاہر ہے کوئی شاعر یا ادیب ان تبدیلیوں سے اپنے آپ کو یکسر الگ نہیں رکھ سکتا اور نہ رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنے آپ کو یا اپنے فن کو سماج کی شکست و ریخت کو اپنے فن کا حصہ نہیں بناتا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی شاعری یا فن ادب کا اعلیٰ نمونہ بن جائے مگر اسے عصری ادب قطعی نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ادیب و شاعر کا مطالعہ صرف کسی صنف کے ارتقا کے سلسلے میں تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے عہد کے پس منظر میں اس کا فن مصنوعی نظر آئے گا، نشورؔ کی کامیابی کا راز بہت کچھ اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے سماج اور تہذیب کی بدلتی ہوئی قدروں کو نہ صرف اپنی شاعری کی قدریں قرار دیا بلکہ اپنی شاعری میں برتا بھی۔

نشورؔ کے عہد میں نظم کے سب سے بڑے شاعر اور سب سے منفرد شاعر علامہ اقبالؔ تھے ان کے علاوہ جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری بھی نظم گوئی میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے، اور اردو شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ماحول میں نشورؔ واحدی نے نظم نگاری شروع کی، شعوری اور غیر شعوری طور پر ان متذکرہ بالا شعرا سے وہ متاثر بھی ہوئے۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ خود فرماتے ہیں:-

> "جب مجھے قومی اور ملکی مسئلے پر شعر کہنا ہوتا تھا تو میں نظم کی طرف رجوع کرتا تھا کہ اقبال کی طرح پیغام دوں کہ وطن کیا ہے، وطن کی خدمت کیا ہے۔ ویسے میری نظموں میں، میں انکار نہیں کر سکتا کہ جوشؔ اور فراقؔ کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب میں رومانی نظمیں کہتا ہوں تو نظیر اکبر آبادی، جوشؔ اور فراقؔ تینوں سے ایک الگ رنگ میرے یہاں نکلتا ہے۔"[1]

نشورؔ واحدی کے مزاج اور ان کے شاعرانہ فن کو سمجھنے کے لئے ان کے

---

[1] نشورؔ واحدی سے کے۔ کے نیر کا انٹرویو مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۲ء

نظم نگاری کے چار ادوار قائم کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ شورِ نشور کا دور ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۲

۲۔ آتش و نم کا دور ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۶

۳۔ فروغ جام کا دور ۱۹۴۶ سے ۱۹۵۹

۴۔ غیر مطبوعہ کلام کا دور ۱۹۵۹ سے ۱۹۸۲

۲

پہلے دور (شورِ نشور) کی نظمیں زیادہ تر انقلابی ہیں اور جنھیں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ نشور واحدی نے بھی ملک کی آزادی کی جد و جہد میں اپنے اشعار کے ذریعہ جوش و ولولہ پیدا کیا، اور ہندوستان کی آزادی کے لئے انقلابی اشعار لکھے۔ اور قوم کو بیدار کیا۔ اسلم ہندی صاحب نے اس دور کی نظموں کی ساری خصوصیات چند الفاظ میں بیان کر دی ہیں۔

"یہ مجموعہ نتیجہ ہے معراج فکر کا۔ شاعر نے سماجی، اخلاقی، وطنی اور روحانی بلند نظریات کو کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ پڑھ کر صرف حیرت ہی نہیں بلکہ اس کی گراں قدر شخصیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کا صرف ایک شعر انقلاب عظیم کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ شاعر کا نغمہ جام آزادی سے کم نہیں"[1]

"فرزند مشرق" کے عنوان سے ایک نظم نشور نے کہی ہے جو بڑی ہی فکر انگیز ہے۔ اس میں نشور اپنے وطن کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

---

[1] اسلم ہندی، پیش لفظ، شورِ نشور طبع (۱۹۴۲) ص ۳

تو اے فرزند مشرق جلوۂ خورشید پیدا کر
شب ہندوستاں کو مشرق صبح تجلی کر
علوم مشرق و مغرب میں ہیں پہلو سیاہی کے
تو اپنی مشعلِ تحقیق سے عالم اجالا کر

"خرابۂ وطن" میں شاعر ہندوستان کی عظمت رفتہ کو گنواتا ہے۔ اور ان کی نشاندہی کرتا ہے اور ذہنوں کو ان کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

مری خاک وطن کا ساکت و خاموش ہر ذرہ
مقاماتِ کہن کا بے خود و بے ہوش ہر ذرہ
یہ ٹکڑے پتھروں کے اور یہ ٹوٹی ہوئی اینٹیں
ابھی تک جن کے دامن پر ہیں رنگِ رفتہ کی چھینٹیں
کھجوروں کی قطاریں اور خس و خاشاک کے جنگل
شہیدوں کی مزاریں اور اس پر ڈھاک کے جنگل
یہ سب کچھ صورت تصویر مجبے زبانی ہے
مگر اپنی جگہ اک عہد رفتہ کی کہانی ہے

"انفرادیت" کے عنوان سے نشور نے ایک مختصر نظم کہی ہے۔ مگر ان کے وطن کے تصور کی بھرپور ترجمانی اس نظم سے ہوتی ہے ؎

وطن وطن کی جنگ میں مجھے وطن عزیز ہے
مگر نزاع زندگی میں ماؤ و من عزیز ہے
وطن ہے فرد کے لئے نہ فرد لقمۂ وطن
ہزار روس و ہند و چیں سے ایک تن عزیز ہے

نشور واحدی نے اس دور میں انقلابی نظمیں خاصی تعداد میں کہی ہیں جن میں

"ایک بار اٹھ"، "آج کے گیت"، "محل شناسی"، "وطن کا سپاہی" اور "آتش نشاں" قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نشور واحدی کو اپنے ملک سے کس قدر دلی لگاؤ تھا۔ اور وہ اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے کس قدر بے تاب تھے۔

"اک بار اٹھ" کے عنوان سے ایک قطعہ ہے جس میں نشور صاحب قوم کو بیداری کا سبق دیتے ہیں ؎

بیدار ہو اور خواب کی تعبیر بدل دے
آزاد ہو اور دہر کی تعمیر بدل دے
اوراقِ شب و روز کی تحریر بدل دے
اک بار اٹھ اور گردشِ تقدیر بدل دے

"آج کے گیت" ایک بڑی پُرجوش نظم ہے جو شاعر کے درد دل اور اس کے جوش و خروش کی مظہر ہے ؎

چھوڑ دے جام شراب
توڑ دے چنگ و رباب
تلخ ہے عیشِ شباب
زندگی ناکامیاب
آگیا وقتِ عمل

ہم سے ہے صبحِ بہار
ہم سے ہے لیل و نہار
زندگی تاریک و تار
صورتِ عالم فشار

آگیا وقتِ عمل

"محل شناسی" کے عنوان سے نشور نے بڑی پُرکیف مگر جوشیلی نظم کہی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے انقلاب پھوٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے ؎

جدال ہے تو کھول منہ، زبان ہو، بیان ہو
کلام وہ کلام کر کہ سر پہ انجمن اٹھا
قتال ہے تو جست کر، سلاح تول رن میں آ
حیات دے، ممات لے جنازہ بن، کفن اٹھا

"وطن کا سپاہی" کے عنوان سے نشور نے اس کے خد و خال کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور اس کے جوش و ولولے کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کر دیا ہے جیسا کہ وطن کے سپاہی کو ہونا چاہیئے۔ بلکہ وطن کے سپاہی میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں نشور نے اس نظم میں سب کو یکجا کر دیا ہے۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں ؎

وہ بینڈ کی صدائے دل رُبا پہ ناچتا ہوا
لڑائیوں کی آتشیں نوا پہ ناچتا ہوا
بہادروں کے نام دل فزا پہ ناچتا ہوا
وہ گولیوں کی آخری صدا پہ ناچتا ہوا

بڑھا چلا ہی جا رہا ہے بولتا ہوا "بزن"

مزاج تیز، دل کرخت تیوروں میں بانکپن
کشادہ سینہ، قد دراز، ابروؤں پہ کچھ شکن
وہ جامۂ سپہ گری وہ دل کشا نظام تن
اٹھائے دستِ آہنی پہ ایک دل نگار گن

تمامتر نظام ہست و بود توڑتا ہوا
ادھر ادھر حیات کے قیود توڑتا ہوا
وہ دشمنوں کے آہنی حدود توڑتا ہوا
غرور توڑتا ہوا، نمود توڑتا ہوا
بڑھا چلا ہی جارہا ہے بولتا ہوا "بزن"

یہ پوری نظم بڑی جاندار، پُرجوش اور ولولہ انگیز ہے۔

اسی طرح ایک نظم "آتش فشاں" ہے جو بڑی دلکش، جوشیلی اور پُر آہنگ نظم ہے۔ جو شاعر کی ہمہ گیر طباعی اور خلاقیت کی تابناک مثال ہے۔ دو بند پیش کیے جاتے ہیں ؎

سیاہ طوفاں کے صرصروں سے لرز رہی ہے کتاب عالم
کڑکتے بادل کی گردنوں پر سوار ہے انقلاب عالم
تباہی و خاک دخوں کے سانچوں میں ڈھل رہا ہے شباب عالم
میں اپنے نغمات آسماں زن سے توڑتا ہوں رباب عالم
مری رگوں میں پیام محشر کے شاعروں کا لہو رواں ہے

میں دورِ تعمیر چرخ و انجم میں تیغ تخریب مہر و مہ ہوں
میں رعشۂ شام معرکہ ہوں میں صبح رنگیں قتل گہ ہوں
میں مالکِ دشنۂ قضا ہوں میں خالقِ قسمتِ سیہ ہوں
میں نازکِ قبضۂ عدم ہوں میں ضربِ شمشیر لا الٰہ ہوں
مری رگوں میں پیام حق کے پیمبروں کا لہو رواں ہے

نشور واحدی نے سماجی مسائل پر کئی نظمیں لکھی ہیں ان میں "نئی دلھن" اور "نجات [illegible] علی" بڑی اہم [illegible] دونوں نظموں [illegible] کیفیت اور ابتلا

کے تحت آتی ہیں۔ وہی فلاکت اور حرماں نصیبی، افلاس اور دورِ حاضر کی غلامانہ تعلیم کے حصول کے باوجود نوکری کے دروازے بند اور وہی ساس نندوں کی روایاتی ستم رانیاں جس کا تذکرہ نشور نے اپنی نظم میں کیا ہے ان افسانوں میں نہ کوئی خصوصیت ہے اور نہ ندرت اور نہ فنی حیثیت سے اس کو پرکھا جا سکتا ہے۔ موضوع بھی کچھ ایسے ہیں کہ اس میں ادب کی بھرپور چاشنی کی تلاش غیر ضروری ہے۔ بہر حال جہاں تک ان دونوں کہانیوں کا تعلق ہے یہ ایک افسوس ناک نقشہ ہے اور درد و غم کا تاثر قدرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آئی تھی دلھن گھر میں جو کچھ روز کی بیاہی
لائی تھی یہاں اس کو بھی قسمت کی سیاہی
خاوند کو آتا تھا فن پارچہ دوزی
لیکن نہیں ملتی تھی اسے شہر میں روزی

خاوند جو آتا تو پریشان گھر آتا
یہ دیکھ کے دل اور بھی دلھن کا بھر جاتا
مخمور نگاہیں مگر آنکھوں میں اداسی
جیسے کہ کسی شاخ پہ دو پھول ہوں باسی

مخمور نگاہی کے ساتھ اداس آنکھوں کی تشبیہ بڑی عجیب اور انوکھی ہے۔ "دو باسی پھول" کسی شاخ پر کیا کہنا۔ نشور جیسے فنکار ایسی ہی دل لگتی اچھوتی تشبیہیں پیش کرتے ہیں ؎

تھی چہرے پہ بیٹھی ہوئی اک گرد ملالی
ان چودھویں راتوں میں بھی پھیکی تھی اجالی

یہ تشبیہ بھی کیا خوب اور نادر روزگار ہے۔ اظہار احوال کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں سے

روز آنہ وہی صبح وہی شام کا عالم
آغاز جوانی میں تھا انجام کا عالم

"آغاز جوانی میں انجام کا عالم" ایک مختصر سا جملہ ہے لیکن ایک عرصۂ دراز پر محیط ہے۔ بچپن سے کہولت تک کا یہ عرصۂ طویل دو تین لفظوں میں سمو کر رکھ دینا شاعری کا کمال ہے کہ ایک نئی نویلی دلھن سو ڈیڑھ سو سال کی بڑھیا نظر آنے لگتی ہے۔ بالآخر گردش روزگار کے چکر میں دلھن کا یہ حشر ہوا سے

گھلتا گیا جسم اور بگڑتی گئی حالت
دکھلانے لگی موت کی تصویر علالت
اکھڑی ہوئی تھی سانس تو دل بیٹھ گیا تھا
اک نزع کے عالم کے سوا کچھ نہ رہا تھا
شوہر کی طرف دیکھ کے حسرت سے نظر کی
اور آخری ہچکی تھی قیامت کی سحر کی
غربت میں یہ اک اور ستم موت نے ڈھایا
چندے سے غریبوں کے کہیں سے کفن آیا

یہ صورت حال آج بھی موجود ہے۔ غربت و افلاس و بے روزگاری کا وہی عالم، حرماں و بدنصیبی کا وہی رنگ ڈھنگ، ساس نند کے مظالم، وہی آج کی دنیا ایسے دلدوز واقعات سے خالی نہیں البتہ ایک حساس دل شاعر کی طرح نہ ہماری نظر ادھر جاتی ہے نہ ہمارا قلم حرکت میں آتا ہے۔ نہ ہمارے خفتہ احساسات و جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ نشور واحدی صاحب دل تھے انھوں نے ان واقعات کو محسوس کیا اور یہ درد بھری داستان ان کی نوک قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر آگئی۔ نشور نے کھینچ تان کر یا صنائی دکھا کر اس میں درد کا پہلو نہیں رکھا ہے بلکہ سیدھے سادے انداز میں واقعہ کو من وعن پیش کر دیا ہے۔ واقعہ بجائے خود پر درد ہے اس لئے "حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را" اور یہی نشور صاحب کا کمال ہے۔

دوسری نظم "نوجوان طالب علم" کے عنوان سے ہے سے

باشندہ مرے شہر کا ایک دوست تھا مرا
ہموار جبیں، آنکھ بڑی، جسم چھریرا
اخلاق میں پاکیزہ، طبیعت میں لطافت
ہر بات سے جیسے کہ ٹپکتی تھی ذہانت

اس لڑکے کے والد نوکر تھے۔ لڑکا پٹنہ کالج میں پڑھتا تھا۔ جب دوسرے سال وہ "ایف، اے" میں آیا تو باپ کا انتقال ایک وبا میں ہوگیا۔ روٹی روزی کے چکر میں پڑھائی مشکل ہوگئی تاہم لڑکے نے ہمت نہ ہاری، ٹیوشن کر کے کسی طرح بی۔ اے کر لیا اور گھر کا خرچ بھی چلاتا رہا۔

جب پاس ہوا بی۔ اے تو مادر ہوئی مسرور
شادی کے لئے ماں نے اسے کر دیا مجبور

اس طرح اخراجات بڑھ گئے۔ غریب لڑکے نے ہر محکمے میں درخواستیں بھیجیں لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔

بیکار ہوا جب کہ وہ تقدیر کا مارا
دل ٹوٹ گیا دیکھ کے گردش میں ستارا

دوڑ دھوپ، کوشش پیروی جاری رہی، پھر اس کو کچھ ٹیوشن مل گئے،

لیکن اس سے کہاں تک کام چلتا، تنگیٔ دعسرت بحال رہی۔ غم واندوہ سے نڈھال ہوگیا، صحت بگڑنے لگی۔ ماکولات ومشروبات اسے میسر نہ تھے جس سے جسم کی معقول پرورش ہوسکے۔ گرمی کا زمانہ تھا، کھانسی آئی کھانسی میں خون دکھائی پڑا۔ نہ دوا کی قیمت نہ غذا کا ٹھکانا۔ مایوسی اور محرومی نے تنکے کو پہاڑ بنادیا ؎

موت آگئی نزدیک بڑھی خون کی کھانسی
وہ نزع کا عالم تھا کہ افلاس کی کھانسی
کیا عرض کروں اس کی شب مرگ کا عالم
خوں تھوک رہا تھا کہ وہیں ٹوٹ گیا دم
اس لاش جواں مرگ پہ رو رو دیے دشمن
ماں بیٹھ گئی اور گری لاش پہ دلہن
سب ختم ہوئی دل کی امنگوں کی کہانی
اور قبر کی آغوش میں سوئی تھی جوانی

افسانۂ غم ختم ہوگیا۔ شاعر اگر تفصیلات میں گیا ہوتا تو یہ دونوں ہی سے کہانیاں بڑی لمبی چوڑی داستان غم (منظوم) ہوکر سامنے آتیں اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو شائد یہ کہانیاں اپنے قدرتی تاثرات سے ضرور محروم ہوجاتیں۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے داستانِ غم کو پھیلاکر اپنے زور بیان کا ثبوت نہیں دیا اور نہ ہی بیجا طوالت دی ہے بلکہ شاعرانہ ایجاز سے کام لیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں بڑی قابل قدر ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ دونوں نظمیں شاعر کے دل و دماغ نے محض نظم گوئی اور لفاظی کے لئے نہیں لکھیں ورنہ یہ دونوں نظمیں یقیناً غیر ضروری طوالت سے خالی نہ ہوتیں۔ بلکہ ہوا یہ ہے کہ یہ دونوں واقعات نشورؔ واحدی کے مشاہدے میں آئے ہوں گے اور نشورؔ نے انھیں نظم کردیا ہوگا۔

دوسرے دور (آتش ونم) کی نظمیں پہلے دور کی نظموں سے مختلف ہیں۔ دوسرے دور میں نشورؔ واحدی کی انفرادیت خاص طور سے دکھائی دیتی ہے اور انھوں نے اس دور میں اپنا لب ولہجہ پالیا ہے۔ اس پر کسی شاعر کا اثر نہیں ہے نہ ہی انھوں نے کسی کی تقلید کی ہے۔ ان کی نظموں کا رنگ فکر وفن کے لحاظ سے بالکل بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب نظم گوئی اور غزل گوئی پر بحثیں چل رہی تھیں۔ شعرائے کرام عموماً دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک گروہ پرانی قدروں کا امین اور ہم نوا تھا اور قدامت پسند کہلاتا تھا اور دوسرا گروہ جس کا رجحان زیادہ تر نظم کی طرف تھا اور ایک طرح سے سوشلزم کی تحریک کا نقیب تھا اور ترقی پسند گروہ کہلاتا تھا۔ جس نے بلند بانگ دعووں اور پُرفریب نعروں سے بہت لوگ گمراہ ہو رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ روشنی بھی لے رہے تھے۔ نشورؔ واحدی کی ترقی پسندی کے بارے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس تحریک سے متاثر ضرور ہوئے مگر گمراہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے اس ظلمات میں قدم ضرور رکھا مگر روشنی کے دھارے سے الگ نہیں ہوئے۔ فیض احمد فیضؔ، فراقؔ، جذبیؔ، سردار جعفریؔ، وامقؔ جونپوری، مجروحؔ سلطان پوری، جاں نثار اخترؔ اور غلام ربانی تاباںؔ جو ان کے ہم عصروں میں تھے ان میں ہر ایک نے شاعری کے میدان میں اپنا اپنا الگ لب ولہجہ اختیار کیا اور یہ لوگ کسی نہ کسی سیاسی عقیدے سے منسلک بھی رہے۔ لیکن نشورؔ صاحب کے بارے میں یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ سیاسی گروپ بندیوں سے ہمیشہ آزاد رہے۔ انھوں نے کھل کر کبھی سیاسی عقیدے کی ہمنوائی نہیں کی ہے۔

نشورؔ اور ان کے ہم عصر شعرائے کرام میں بہت سے مضامین مشترک ملیں گے

نازک اور پر پیچ خیالات واحساسات کی حامل ہے۔ نشور کی نظم نگاری کے متعلق فراق گورکھپوری نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔

"نشور واحدی کے کلام کا یہ مجموعہ بڑی خوبصورت شاعری کی مثال ہے۔ یہ نظمیں صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں۔ موجودہ دور زندگی کی پرخلوص ترجمانی ان لفظوں میں کی گئی ہے۔ لیکن دور حاضر یا گذشتہ ادوار کے کسی مشہور شاعر کا منہ ان نظموں میں نہیں چڑھایا گیا ہے۔ نقالی کی پرچھائیں تک ان نظموں پر نہیں پڑتی۔ نشور کا تخیل نازک بھی ہے اور صحت بخش بھی۔ ان کی درد بھری آواز میں نرمی بھی ہے، ترنم بھی ہے اور توانائی بھی ہے۔ ان میں کئی نظمیں تو ہندوستان میں بجا طور سے مشہور ہو چکی ہیں۔ جو لوگ ان نظموں کو پڑھیں گے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نشور کے تخیل اور وجدان میں ایک ایسی گنگناہٹ ہے جس کے تموج کی لکیریں انفرادی خدوخال رکھتی ہیں۔ نشور کی رفتار خیال میں وہ نرم روی ہے اور اس کی آواز پا میں وہ جھنکار ہے جسے ہم فردوس گوش و نظر کہہ سکتے ہیں۔ آواز کی یہ حلاوت اور گھلاوٹ نشور کی بالکل اپنی چیز ہے جس پر نشور بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ زور بیان، قدرت اظہار، رنگینی تشبیہ و استعارے، قوت مصوری، غرض کہ قادر الکلامی اور تخیل کی رنگارنگی اور تکمیل فن کی

درد محبت اور درد انسانیت کا بھی نہایت شد و مد سے اظہار کئی نظموں میں نظر آئے گا۔"[2]

علاوہ ازیں ڈاکٹر آمر لاری کا یہ بیان بھی صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ "اس مجموعے میں وہ اقبال کے سحر سے آزاد ہو گئے ہیں اور ان کی انفرادیت پورے طور پر نمایاں ہوئی ہے۔"[3]

سب سے پہلے ہماری نظر نشور کی پہلی نظم "فضائے گیتی" پر جاتی ہے۔ بقول فراق گورکھپوری "ایسی نظم سے آتش و نم" کا ساز شاعر نے چھیڑا ہے۔"[1]

دھواں چھایا ہوا تھا نور کا تا اوج امکانی
کہ مجھ کو دور سے آئی نظر مٹی کی تابانی
سہارے آرزوئے شوق کے پلکوں سے یوں ٹوٹے
کہ ان کی ضو سے روشن ہو گئی دنیائے انسانی
گناہِ زیست نے رکھا قدم جس آستانے پر
حقیقت نے اسی چوکھٹ پہ رکھی اپنی پیشانی
مگر نزدیک سے دیکھا تو عبرت ناک منظر تھا
کہ ظلمت نے پہن رکھا تھا ملبوس درخشانی
رخِ مہتاب مفلس کی جوانی کی طرح پھیکا
شعاعِ مہر نے دہشت سے چادر رات کی تانی

---

[1] فراق گورکھپوری۔ مقدمہ آتش و نم ص ۱۳-۱۴
[2] ڈاکٹر آمر لاری۔ "نشور واحدی کی شاعری آتش و نم کے آئینے میں" آتش و نم، ص ۲۶
[3] فراق گورکھپوری۔ مقدمہ آتش و نم ص ۱۴

یہ دنیا ہو نہیں سکتی منور اب ستاروں سے
اسے روشن کر دیا پھونک دو دل کے شراروں سے

یہ نظم بڑی گہری، علمی اور فلسفیانہ رنگ و بو سے معمور و مملو ہے اور اس کے مفاہیم بھی تہہ در تہہ ہیں شاعر کا انداز بیان اور اس کی نازک خیالی جس بلند مرتبہ پر فائز ہو کر بروئے مشاہدہ آرہی ہے اور جو تاثر پیدا کر رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

" رات " کے عنوان سے ایک نظم نشور واحدی نے کہی ہے یہ نظم بھی فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

جنبشِ عالم ہے نغمہ پردۂ آرام کا
نور اک چلتا مسافر ظلمتِ انجام کا
صبح رنگیں ترجمہ افسانہ ہائے شام کا
تیرے فردا میں ہے اک پرتو جمال دوش کا

" یزداں سے " کے عنوان سے ایک بلند پایہ فلسفیانہ نظم ہے۔ بقول فراق گورکھپوری، " یہ بڑی گہری نظم ہے۔ مسئلہ ارتقا اور فلسفۂ تغیر کو جس ہلکے پھلکے اور گہرے انداز میں شاعر نے پیش کیا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیکھنے کی نہیں بلکہ حقیقت میں ڈوب جانے کی دعوت یہ نظم دیتی ہے "۔ [1]

تری وحدت سرا میں راہ پیما ہے بیاں میرا
تخیل سے بھی آگے جا رہا ہے کارواں میرا
تو پابند حیاتِ دائمی ہے ہر زمانے میں
مگر قادر ہے مٹنے پر بھی نقشِ جاوداں میرا

---

[1] فراق گورکھپوری، " مقدمہ آتش و نغم " ص ۱۷

ترا دستِ قوی ہر فطرتِ جاوید کا خالق
شکستِ بندشِ تقدیر دستِ ناتواں میرا
تری دنیا مرے امکان کی وسعت نہیں رکھتی
مری ہستی بھی میری تو بھی میرا دو جہاں میرا

نشور واحدی نے اس دور میں انقلابی نظمیں بھی کہیں ہیں۔ چونکہ یہ زمانہ جد و جہد آزادی کا زمانہ تھا اس لئے نشور واحدی نے سیاسی اور وطنی مسائل سے متاثر ہو کر اور انھیں موضوع سخن بنا کر عوام تک پہنچایا۔ اس طرح اس دور میں نشور واحدی نے " خون میں پانی " " انقلابی " " انفاس ناتمام " جیسی انقلابی نظمیں کہی ہیں۔

" خون میں پانی " یہ ایک انقلابی نظم ہے۔ جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نشور صاحب کتنے حریت پسند مجاہد، بے باک پُر عزم اور پُر جوش آزادی کے سپاہی تھے۔ ان کے بس میں صرف الفاظ کی تلوار تھی۔ ولولۂ آزادی سے بھرا دل تھا اور انگلیوں کی گرفت میں مجاہد کا خنجر تھا۔ اور وہ آزادی کی جنگ جاری رکھ کر ملک کی مکمل آزادی کے خواہش مند تھے ؎

دھوکا ہے خیالِ آزادی پیغام زبانی جب تک ہے
شیروں کا سر مغرور یہاں روباہ کہن سے نیچا ہے
زندوں کا لباس تن بھی یہاں مردوں کے کفن سے نیچا ہے
کہسار ہمالہ کا سر بھی توہین وطن سے نیچا ہے
اک داغ ہے یہ تاریخ ستم دنیا کی کہانی جب تک ہے
آزاد شہیدوں سے میں نے پھر خون کے رشتے جوڑے ہیں
میدانِ سنان و خنجر میں کچھ دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں

افسردہ رگوں میں غیرت کی احساس کے شعلے توڑے ہیں

ٹھنڈا نہیں ہوگا میرا لہو گنگا کی روانی جب تک ہے

یہ خون جو میرے تن میں ہے طوفانِ جہاں بن جائے گا

قوت کے پہاڑوں کے حق میں شعلوں کا مکاں بن جائے گا

آنکھوں میں اتر آئے گا کبھی اور اشکِ رواں بن جائے گا

جم کر نہ رہے گا پلکوں پر اس خون میں پانی جب تک ہے

اس کے علاوہ " انقلابی " کے عنوان سے جو نظم نشور نے کہی ہے اس کے لفظ لفظ سے انقلاب برپا ہوتا ہے اور شاعر کا ذہن کتنا انقلابی ہے اسے اشعار کے ذریعے دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے ؎

تعیش میرے آگے بھول جاتا ہے اداکاری

مری کشتِ بقا میں خونِ دل کرتا ہے گل کاری

مرا مسلک ہے تیغِ خودسری اور دستِ ہشیاری

میں فطرت سے لپک صہبا سے مستی چھین لیتا ہوں

میں پانی چھانتا ہوں اپنی پیشانی و ابرو سے

میں مٹی تولتا ہوں خونِ انساں کے ترازو سے

میں روزی بانٹتا ہوں اہتمامِ زور بازو سے

میں میکائیل سے روزی کی جھولی چھین لیتا ہوں

نشور واحدی نے معاشرتی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن میں " ناداروں کی عید " کو کافی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نظم میں انھوں نے حقیقت بیان کردی ہے۔ عید کے دن جب کہ ہر مسلمان خوشی مناتا ہے ایک غریب اس روز کیا احساس کرتا ہے اس کا صحیح نقشہ نشور واحدی نے کھینچا ہے اور سرمایہ داروں پر انھوں نے زبردست چوٹ بھی کی ہے۔ بقول نفیس بانو " ناداروں کی عید مشہور معاشرتی نظم ہے۔ یہ نظم درد و تاثیر کے جذبات سے لبریز ہے اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام پر بھرپور طنز ہے "[1]

زوردار نمازی عید کے دن کپڑوں میں چمکتے جاتے ہیں

نادار مسلماں مسجد میں جاتے بھی ہوئے شرماتے ہیں

ملبوس پریشاں دل غمگیں افلاس کے نشتر کھاتے ہیں

مسجد کے فرشتے انساں کو انسان سے کمتر پاتے ہیں

قرآں سے دھواں سا اٹھتا ہے ایماں کا سر جھک جاتا ہے

تسبیح سے اٹھتے ہیں شعلے سجدوں کو پسینہ آتا ہے

ہو واسطہ جن کو فاقوں سے روزے وہ بچارا کیا رکھے

دن دیکھ چکا شب دیکھ چکا قسمت کا سہارا کیا رکھے

خالی ہوں لہو سے جس کی رگیں وہ دل کا شرارا کیا رکھے

ایمان کی غربت دیں کا بھرم افلاس کا مارا کیا رکھے

تاریک دکھائی دیتی ہے دنیائے مہ و خورشید اسے

روزی کا سہارا ہو جس دن وہ روز ہے روزِ عید اسے

اک مادرِ مفلس عید کے دن بچوں کو لئے بہلاتی ہے

سر ان کا کبھی سہلاتی ہے نرمی سے کبھی سمجھاتی ہے

قسمت پہ کبھی جھنجھلاتی ہے جینے سے کبھی تنگ آتی ہے

زردار پڑوسن خوش ہو کر سب دیکھتی ہے اور دکھاتی ہے

---

[1] نفیس بانو، عہد جدید کی آواز نشور واحدی، ضیا پبلیکیشن ۱۹۸۵ء ص ۱۰۰

پیسے کا پجاری دنیا میں سچ پوچھو تو انساں ہو نہ سکا
دولت کبھی ایماں لا نہ سکی سرمایہ مسلماں ہو نہ سکا

ایک نظم "حسن نامتمام" ہے جو زبان اور اظہار بیان کے لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے اور اس نظم کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر بار ایک نیا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ صرف ایک بند پیش خدمت ہے ؎

جذبات بجھ گئے ہیں دل بے قرار کے
کٹتے ہیں فکر تلخ میں لمحے بہار کے
روٹی ملی ہوئی ہے تخیل میں یار کے
بھوکی نگاہیں دیکھ رہی ہیں شکم ابھی

"انفاس نامتمام" بھی ایک معاشرتی نظم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

سفینہ ظلم کا یوں خون انسانی میں کھیتے ہیں
رگ مزدور سے شاید لہو تک چوس لیتے ہیں
ادارے سانس چلنے کے لئے تنخواہ دیتے ہیں
تن لاغر شکستہ دل سے محنت کیا کرے کوئی

"طرز نو" میں نشور نے جدید نظمیں شامل کی ہیں۔ ان میں سب اپنی اپنی جگہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ فراق گورکھپوری ان نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں "طرز نو کی ان نظموں میں بھی خیال اور آواز کے سانچے شاعر نے خود ڈھالے ہیں۔ طرز بیان اور طرز خیال اور نظموں کی اسکیم یا چربہ اپنے کسی ہم عصر کے یہاں سے نہیں چرائے ہیں"[1]

---

[1] فراق گورکھپوری، مقدمہ آتش و نم ص ۱۹

ان نظموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نشور صاحب جدیدیت اور ترقی پسندی کے خلاف نہ تھے بلکہ فی نفسہ وہ ترقی پسند تھے۔ ترقی پسندی کے دل و جان سے حامی تھے۔ نشور واحدی خیالات کے اعتبار سے بھی ترقی پسند تھے اور ان کے تصورات بھی ترقی پسندانہ تھے۔ وہ عالم ہونے کے باوجود روشن خیال تھے۔ ان کے مزاج میں صفائی اور ستھرائی تھی وہ علم جدید کے خلاف نہ تھے۔

"طرز نو" کی نظموں میں "زیست"، "پنجۂ صیاد"، "روٹی"، "امید کی کرن"، "جبیں جبیں"، سبھی اچھی اور بہترین نظمیں ہیں۔ نظم "روٹی" پیش کی جاتی ہے جس کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے۔ اس نظم میں روایت اور تقلید کو دخل نہیں ہے۔ یہ جدید رنگ کی ہوتے ہوئے بھی ایک فنی ڈھنگ سے کہی گئی نظم ہے۔ اس نظم میں نشور کا اپنا مخصوص رنگ خاص طور سے نمایاں ہے ؎

زندگی یہ ہے کہ روٹی کو پکڑ دانت سے تو
اور خاطر میں رہے دولت آقا کا مزاج
ایک مٹھی یہ اناج
بیش قیمت ہے تری زیست کے ادراک سے بھی
جذبۂ پاک سے بھی
بستر مرگ پہ آرام دل زار سہی
حسن بیمار سہی
جگمگاتی ہوئی کرنوں میں ہے دفتر کا پیام
یا لرزتا ہوا کام
تجھ سے کہتا ہے کہ اے بستۂ زنجیر امید

مجھ کو دینا ہے ابھی گرسنہ ہمت کا ثبوت
لب پہ اک مہرِ سکوت
علم کی گردنِ نازک پہ ہے آہن کی طرح
دیوِ تنخواہ کا ہات
زیست کی سانس اکھڑ جائے تو کچھ بات نہیں
ایک مٹھی یہ اناج
بیش قیمت ہے ترے نزع کے انفاس سے بھی
پیکرِ روحِ بہیمی یہ ہے دولت کا غلاف
اس پہ گلکاری صاف
چشمِ ظاہر میں ہے نظارہ خوش رنگ ولطیف
اندروں حشوِ کثیف
اک ذرا اندوزِ نجاست پہ ہے طاعت کی جبیں
سجدہ بے سوز نہیں
آتشِ جوع سے پگھلا ہوا یہ حسِ غیور
ایک طوفاں کا تنور
جس پہ منہ بند ہے روٹی ہی کے سرپوش سے آج
ایک مٹھی یہ اناج
قابلِ سوخت ہے ترے شکمِ آز کے ساتھ

"دنیائے رنگیں" میں نشور نے ساون، ناز آفریں، بسنت، سرشاری، جھرمٹ، بھرپور جوانی، غارت گرِ حسن ہندوستان، کالج کا ایک حسین داخلہ وغیرہ نظمیں شامل کی ہیں۔ یہ ساری نظمیں رومانی خیالات کی مظہر ہیں۔

"ساون" بڑی پیاری اور دل موہ لینے والی نظم ہے۔ بلکہ شروع سے آخر تک خوبصورت الفاظ کا ایک مرقع ہے، ایک مرصع گل دستہ ہے جس کو چابکدست شاعر نے جذبات، انسانی واردات و احساسات کے معطر پانی میں غوطہ دے کر ریشم کی نرم لڑی میں پرو کر آئینۂ خیال اور بزمِ جمال میں رکھ دیا ہے اسے پڑھتے رہیئے اور پھر بھی تشنگی باقی رہتی ہے ؎

ساون جو چڑھا پھر باغوں اور جھولوں کی باتیں ہوتی ہیں
گلشن کی رنگیں سیروں میں کچھ رنگیں گھاتیں ہوتی ہیں
جب عہدِ جوانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی برساتیں ہوتی ہیں
متوالی عمریں ہوتی ہیں متوالی راتیں ہوتی ہیں
ایسے میں کوئی یاد آتا ہے ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے

"ناز آفریں" بھی ایک رومانی نظم ہے۔ الفاظ کے دروبست، محل استعمال، خیالات کی نزاکت ولطافت، تخیل اور تشبیہ کی بہار آفرینی اپنے عروج شباب پر ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ایک لڑکی تھی از بس ہی ناز آفریں
ماہ رو، ماہ رخ، ماہ وش، مہ جبیں
اس کے قد کے تناسب کا عالم نہ پوچھ
حشرِ کن، حشرِ کل، حشرِ دل، حشرِ دیں
اس کی زلفیں سنہری سنہری تمام
مشک بو، عود سا، صندلیں صندلیں

اس کی آنکھوں کا جادو خدا کی پناہ
سرگیں، شرگیں، احمریں، نرگیں
اس کا طرز تکلم سراپا کشش
داستاں، دل رُبا، دل فزا، دل نشیں

اس نظم میں خوبصورت الفاظ، خوش رنگ تشبیہات سے ایک پیکرِ جمال کا ایسا سراپا صفحۂ قرطاس پر نشورؔ صاحب نے کھینچ دیا ہے کہ تصویر کے پردے سے سراپا اپنی مجسم شکل میں دیدۂ و دل میں اتر آتا ہے اور نقش دوام بن جاتا ہے۔

"بسنت"، "رس" اور "نمائش گاہ کے جلوے" بھی خوبصورت نظمیں ہیں۔ چند بند ان نظموں کے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نظموں کی اٹھان اپنے شباب پر ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نشورؔ نے حسن کو کتنے قریب سے دیکھا ہے۔ بلکہ اسے جانچا اور پرکھا بھی ہے صحیح معنوں میں نشورؔ اس دور کی شاعری میں شاعرِ شباب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ؎

بسنت :۔ شفاف جبینوں نے جیسے افلاک سے بادل توڑے ہیں
اس شوخ نے آنچل ڈالا ہے اس شوخ نے بازو موڑے ہیں
چہروں پہ نسبتی عالم ہے جسموں پہ بسنتی جوڑے ہیں
اس رنگ نے جانے کتنوں کے احساس پہ محشر ڈھائے ہیں
سرسوں پھولی کلیے پھوٹے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

رس :۔ ہوا میں رس فضا میں رس بہار و بوستاں میں رس
جوانیوں نے بھر دیا ہے جیسے کل جہاں میں رس
نئی نئی جوانیوں کی دلکشی نہ پوچھئے
نظر میں رس لبوں میں رس سخن میں رس بیاں میں رس

ادا کے ساتھ آگئی ہے گفتگو میں دلکشی
کوئی بیانِ حسن ہو نہیں ہیں لطف ہاں میں رس

نمائش گاہ کے جلوے :۔ الھڑ جوانی الھڑ نگاہیں
قاتل وہ بازو قاتل وہ باہیں
اف ری جوانی اف ری نگاہیں
وہ مر ہی جائیں یہ جس کو چاہیں
چنچل جوانی بسمل محبت
چلتی ہیں راہیں بھرتی ہیں آہیں
دوشیزگاں ہیں محشر سراپا
چلئے دکھائیں گر آپ چاہیں
یہ شاعری ہے یا زندگی ہے
یا شعر بن کر نکلی ہیں آہیں

"سرشاری"، "بھرمٹ"، "بھرپور جوانی"، "غارت گر" "حسن ہندوستاں" "کالج کا ایک حسین داخلہ" اچھی رومانی نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں حسن و شباب کی مکمل اور دلآویز تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس کی ہر ہر ادا اور شباب کے تمام لوازمات کا ذکر حقیقی و خاکاتی رنگ میں شاعر نے پیش کیا ہے۔

"غارت گر" ایک بیانیہ نظم ہے جس میں ایک دوشیزہ پیکر کے سن و سال، اعضا، پیکر، رنگ و روپ، قد و قامت، ابرو و گیسو کا ذکر بڑے ہی خوبصورت ڈھنگ سے شاعر نے کیا ہے ؎

یاد آیا اک دلکش منظر
یعنی اک دوشیزہ پیکر

گوری گوری بانہیں اسکی
رنگیں شاخِ گل سے بڑھ کر
موزوں موزوں قامت اس کی
رعنا، دلکش، دل جو، دلبر
اس میں ڈوبی آنکھیں اس کی
جادو بابل، نشۂ ساغر
پلکیں اس کی گھومیں گھومیں
دشنہ، پیکاں، خنجر، نشتر
کالے کالے گیسو اس کے
کوئل، بادل، سنبل، عنبر
دل سینے کے اندر مچلا
سب کچھ میں بھولا لکھ پڑھ کر
دھیمے لفظوں میں میں بولا
اے غارت گر، اے غارت گر
ٹھہری سمجھی اور شرمائی
دیکھا مڑ کر، بھاگی ہنس کر

اس کے بعد "کالج کا ایک حسین داخلہ" کے عنوان سے ایک نظم ہے یہ قدرے طویل نظم ہے۔ اس نظم میں حسن کے بیان میں شاعر نے جزئیات نگاری سے کام لے کر مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ کالج میں اس کا پہلا دن ہے اور بقول شاعر ایک انقلاب سا ہے لڑکوں کی زندگی میں۔ اگرچہ کوئی کام نہیں، کوئی بات نہیں پھر بھی ہر ایک کو اس کا نام جاننے کی خلش ہے۔ یہ نظم انسانی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے حسین اور دلکش چہرہ انسان کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالج میں ایک حسین داخلہ، نادانستہ طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس نظم میں فطرت اور نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور حسن و عشق کی نیچرل کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں شاعر مکمل تصویر ابھارنے کی کوشش کرتا ہے ؎

کالج میں آج بڑھنے آئی ہے اک ستمگر
یہ داخلہ ہے ظالم یا انتظام محشر
زلفِ سیاہ شب کے رومان کی کہانی
آنکھیں سنا رہی ہیں افسانۂ جوانی
ابرو کھنچے کھنچے سے زلفیں گھنی گھنی سی
ساون کی بدلیوں میں پھیلی ہے چاندنی سی
وہ گول گول بازو اور وہ بھری جوانی
سانچے میں ڈھل گئی ہے صہبائے زندگانی
رفتار کی لچک میں انداز خودسری ہے
قد ہے کہ دلکشی خود انگڑائی لے رہی ہے
چالاک انکھڑیوں میں تیور کھرے کھرے سے
آنکھوں میں لے پڑی سی ہونٹوں میں رس بھرے سے
نازک کلائیوں میں وہ چوڑیوں کی کھن کھن
صندل کی ٹہنیوں میں لپٹی ہوئی ہے ناگن
اک حشر کا تناسب اعضائے بیش و کم میں
کستی ہوئی جوانی ساری کے پیچ و خم میں

جب بے خیالیوں میں آنچل ڈھلک رہا ہے
رنگیں جوانیوں کا ساغر چھلک رہا ہے
روشن جبیں پہ جیسے تارا چڑھا ہوا ہے
چاندی دمک رہی ہے پارا چڑھا ہوا ہے
آنکھیں بغیر جاگے جب دیکھئے گلابی
دوشیزگی ہے یا اک دنیائے نیم خوابی
شرماتی اور لجاتی کتراتی اور بہکتی
درجے میں آئی ہے وہ پہلے پہل جھجکتی
رنگیں کتاب دابے ظالم شباب تھامے
دوشیزہ انگلیوں سے دل کا رباب تھامے
عالم کی بجلیاں ہیں اٹھتی ہوئی نظر میں
آواز بھی ہے ظالم ڈوبی ہوئی اثر میں
احساس رنگ و بو میں اس طرح کھوئی کھوئی
جیسے کہ فرش گل پر دوشیزگی ہو سوئی
ہونٹوں سے رس رہی ہے بیتابیٔ تکلم
آنکھوں میں ہلکی ہلکی کیفیت تبسم
رعنائیاں بہکتی دوشیزگی مہکتی
معصوم سادگی سے سرشاریاں ٹپکتی
نظریں جھکی جھکی سی اٹھتی بھی ہیں تو کم کم
جیسے لجا رہی ہو پھلواریوں میں شبنم

بیداریوں میں بھی اک دنیائے خواب ہے وہ
لڑکوں کے واسطے اک رنگیں کتاب ہے وہ
اک انقلاب سا ہے لڑکوں کی زندگی میں
کھوئی ہوئی ہے وہ بھی احساس دلکشی میں
کیا جانے بات کیا ہے کیا جانے کام کیا ہے
ہر ایک کو خلش ہے ظالم کا نام کیا ہے

نشورؔ واحدی یوں تو خالص تغزل کے شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر نظم گوئی میں بھی وہ پیچھے نہیں ہیں۔ شاعر طبعی طور پر حساس ہوتا ہے اور نشورؔ واحدی بے حد حساس شاعر تھے اور یہی ان کی حساسیت ان کو ہر میدان میں کامیاب اور کامگار بناتی ہے۔ چنانچہ میدانِ نظم میں بھی ان کا اشہب قلم اسی طرح سبک گام ہے جس طرح غزلوں میں۔ نشورؔ کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری نے صحیح لکھا ہے:۔

"ان کی نظموں میں بسا اوقات خاموش اچانک پن کے ساتھ ایک بھیانک کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان نظموں میں تلخی اور غم کے ایسے جوہر ملتے ہیں جو دماغی یا جذباتی تعیش کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ جو سنجیدہ تفکر اور ناقدانہ احساس سے اُپجتے ہیں، یہ نظمیں محض ضیافتِ سماع نہیں ہیں بلکہ دعوتِ نظر بھی ہیں اور سستی لذتیت سے یہ نغمے یکسر پاک ہیں۔ ان نظموں کی تکنیک میں تھکا دینے والا اکہرا پن نہیں ہے۔ مقفیٰ، مروف نظموں میں غیر معمولی تازگی اور بنا پن ہے۔ ان نظموں کی تخلیق و تعمیر میں ڈھیلا پن اور پھسپھسا پن نہیں ہے۔ رطب و یابس نہیں ہے جھول نہیں ہے، تر و لیدگی

نہیں ہے، ناہمواری نہیں ہے، تخیل و ترنم کی تھکاوٹ
یا کمزوری کے آثار نہیں ہیں۔[1]

۴

تیسرے دور (فروغ جام) میں نشور نے نظمیں بڑی کم تعداد میں کہی ہیں لیکن جو نظمیں کہی ہیں وہ ان کے دل کی پکار ہیں۔ اس دور کی نظموں میں سادگی، صداقت، اپنائیت اور معقولیت نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان کی نظمیں زندگی کی تصویر ہیں۔ ان کی نظموں کے کردار ایسی دنیا کے کردار ہیں اور جو واقعات و حادثات انھوں نے بیان کئے ہیں وہ مافوق الفطرت نہیں بلکہ زندگیوں میں پیش آتے رہتے ہیں۔ جن مناظر کی وہ تصویر کشی ہمارے سامنے کرتے ہیں ان سے ہماری آنکھیں بہت حد تک مانوس ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں میں ہم ان احساسات کو پاتے ہیں جنھیں ہم نے محسوس تو کیا مگر انھیں کسی پر ظاہر کرنے کی قدرت ہم میں موجود نہ تھی گویا نشور کی نظمیں صرف ان کے ہی نہیں بلکہ ہمارے احساسات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔

نشور کی فکر کی پرواز میں بلا کی بلندی ہے اور اس کے ڈانڈے حقیقت سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری میں تصور کی جلوہ گری اور حقیقت نگاری کا ایسا حسین امتزاج ہے۔ جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک ان کی نظموں میں قوس قزح کے حسین اور دل فریب رنگ بھرے ہوئے ہیں جس کا ہر رنگ دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل و دماغ میں روشن قندیلیں منور

---

[1] فراق گورکھپوری، آتش و نم مقدمہ ص ۱۸-۱۹

کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں بیداری اور جذبات کا مدھم بہاؤ ہے یہی نہیں بلکہ تسلسل، ربط، نزاکت احساس اور پوشیدہ جذبوں کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی کچھ اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کو بلا مبالغہ نفسیاتِ انسانی کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

نشور واحدی کی ایک نظم "جیت" کے عنوان سے ہے۔ چونکہ اس نظم کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے اس لئے اس کا بھرپور جائزہ لیا جاتا ہے۔

جیت کس کی ہے محبت کی کہ تلواروں کی؟
اصل قوت کبھی شمشیر سے حاصل نہ ہوئی
موج ٹکرائی مگر فاتح ساحل نہ ہوئی
برق انداز تبسم کے مقابل نہ ہوئی
بزم ہے لالہ رخوں کی کہ سیہ کاروں کی
جیت کس کی ہے محبت کی کہ تلواروں کی

اردو کا یہ شاعر تلوار پر بھروسہ کرنے والوں کو چیلنج کرتا ہے کہ فی الحقیقت جس کا نام طاقت ہے وہ کبھی بزور شمشیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل پیش کرتا ہے کہ موج کا ساحل سے ٹکرا جانا یا بسا اوقات ساحل پر آ جانا موج کی فتح مندی کی دلیل نہیں۔ ساحل اپنی جگہ پر اٹل حقیقت ہے موج کی دھما چوکڑی اس کی اس پوزیشن کو تبدیل نہیں کر سکتی۔

"برق انداز تبسم کے مقابل نہ ہوئی"

یہ مصرعہ فصاحت و بلاغت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ شاعر نے بڑے اونچے تخیل سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ہے اور بند کے ٹیپ کا یہ حصہ

"بزم ہے لالہ رخوں کی کہ سیہ کاروں کی"

نظم کے ہر پڑھنے والے کے ضمیر کو بڑے دل نشیں پیرائے میں جھنجھوڑا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بتاؤ لالہ رخوں کے جمگھٹے کے مقابلے میں سیہ کاروں کا مجمع کوئی حقیقت رکھتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ہجوم سیہ کاران لالہ رخوں کے اجتماع کے مقابلہ میں ایک دفترِ بے معنی سے زیادہ کچھ نہیں تو پھر شاعر کا یہ سوال ہرگز محتاجِ وضاحت نہیں رہتا کہ ؎

"جیت کس کی ہے محبت کی تلواروں کی"

یقیناً جیت محبت ہی کی ہے اور محبت کے بجائے نفرت سے کام لینے والے آج نہیں تو کل ذلت آمیز ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

آندھیوں نے کبھی سبزے کی کمر توڑی ہے
تیغ نے سلسلۂ موج کو کاٹا ہے کبھی سے
شیشۂ بادِ سحر، سنگ نے توڑا ہے کبھی
جادۂ عام کو پہیوں نے مٹایا ہے کبھی
ظلمتوں نے کبھی رفتارِ سحر موڑی ہے
آندھیوں نے کبھی سبزے کی کمر توڑی ہے

رات کیسی ہی اندھیری کیوں نہ ہو، ظلمتوں نے لاکھ افق پر ڈیرہ ڈال رکھا ہو مگر کیا کبھی صبح کی اٹکھیلیوں میں رات کی سیاہی کوئی خرابی پیدا کر سکی۔ نورِ سحر ظلمتوں کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور رات کا اندھیارا اپنی تمام سیاہ قوتوں کے باوجود صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بتاؤ آندھی کی تمام گرد و غبار سے ملوث طاقت کبھی سبزے کا بال بیکا کر سکی۔ حالانکہ طوفانِ باد سے سبزہ جیسی لطیف اور کمزور طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں، تیغ کی سفاکی تسلیم، لیکن سلسلۂ موج کا خوں آشام تلوار کیا بگاڑ سکتی ہے۔

دنیا میں وہی لوگ سرخرو اور کامیاب ہوتے ہیں جن میں محبت، خلوص اور عاجزی کا مادہ پایا جاتا ہے۔ لوگ اردو شاعری کو گل و بلبل کا مجموعہ سمجھتے ہیں وہ مذکورہ بالا بند کی نادر تشبیہات پر غور کریں۔ کیسے اچھوتے انداز سے اردو کے اس شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جنگ یہ دیر و حرم کی نہیں اے اہلِ جنوں
دُورِ مشرق بھی ہے مغرب کے اشارات کے ساتھ
کعبہ و بتکدہ کے کہنہ نقابات کے ساتھ
ڈوبتے دن نے قدم باندھ لئے رات کے ساتھ
کھا گیا دل کو جگر چاٹ گیا خون کو خوں
جنگ یہ دیر و حرم کی نہیں اے اہلِ جنوں

انقلاب ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے واقعات کے متعلق عام طور پر یہ شہرت ہے کہ یہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان ایک نظریہ کے اختلاف کی وجہ سے کشت و خون ہوا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ خیال خیال نہیں بلکہ معتقدانِ دیر و حرم پر ایک بہتان ہے۔ یہ جنگ دیر و حرم کی جنگ نہ تھی بلکہ مغرب کے اشارات پر مشرق کے "غداروں" کی کرم فرمائی تھی۔ کعبہ اور بت کدہ کے دیرینہ نقاب پہن کر انسانیت کے دشمن غنڈہ عناصر نے جو کچھ کیا وہ ان کی اپنی ذلیل ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔ یہ بہیمانہ حرکتیں نہ کسی ملک کے لئے مفید ہیں اور نہ کسی ملت کے لئے شاعر نے یہ کہہ کر کہ ؎

"ڈوبتے دن نے قدم باندھ لیے رات کے ساتھ"

ہماری آزادی پر جو گہرا طنز کیا ہے وہ اپنی جگہ بجائے خود وضاحت ہے۔ ہندو اور مسلمان کے لئے دل اور جگر کی مناسبت دے کر اور "خون کا خون" کا استعمال

کر کے ٹیپ کے مصرع میں جس بلند نظریہ کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اردو شاعری کے بہترین مستقبل کی دلیل ہے۔ مستقبل میں اس قسم کا لٹریچر ہی زندہ رہ سکے گا۔ انسانیت کو ذلیل کرنے والے اور انسانیت کی آڑ میں حیوانیت کا مظاہرہ کرنے والوں کی تو

"داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

آخر بند میں شاعر ان لوگوں سے جن کو خدا نے دل و دماغ کے ساتھ ضمیر کی آزادی بھی بخشی ہے۔ پھر سوال کرتا ہے کہ ؎

آخری رخصت غم محفل صیاد میں ہے
محشر لالہ و گل شاخ چمن زاد میں ہے
جیسے تاثیر سی مظلوم کی فریاد میں ہے
فتح دیوانوں کی اور ہار ہے ہشیاروں کی
جیت کس کی ہے محبت کی تلواروں کی

اس آخری بند میں شاعر نے ہشیاروں اور دیوانوں کے درمیان جو لطیف پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اسے اظہار مطلب کے لئے انتہائی سبک طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ہشیار سے ایسے عقل مند لوگ مراد ہیں جن کا دائرہ عمل صرف اپنے ہم مسلک لوگوں تک محدود ہے جو "باسماں اللہ اللہ" کے قائل نہیں مگر "با برہمن رام رام" کے قائل ہیں۔ جن کے نزدیک مسجدیں اس قابل نہیں کہ کرۂ ارض سے مٹا دی جائیں اور اپنی پسند کی عبادت گاہوں کا فروغ وہ زمین کے اس سرے سے اس سرے تک چاہتے ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ "اپنا بھلا ہو" جو لوگ ان کے عقیدے ان کی معاشرت، ان کی تہذیب سے اختلاف رکھتے ہیں وہ سب لائق گردن زدنی ہیں۔ ایسے لوگ خواہ کسی طبقہ و خیال کے ہوں

"باسماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے قائل ہیں۔ خود زندہ رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جن کی خواہش ہے کہ سب کا چمن سرسبز و شاداب رہے جن پر ناقوس کی آواز کے ساتھ ساتھ اذان کی آواز بار نہیں گزرتی جو مندر کے پجاری سے بھی اتنے ہی خوش رہتے ہیں جتنے مسجد کے موذن سے جو انسانیت کے خادم ہیں۔ جو اپنی قوم اور ملک کے بہی خواہ ہیں جن کا مسلک صداقت ہے، عدل اور انصاف ہے۔ اردو کا یہ شاعر انھیں "دیوانہ" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے ہی دیوانوں کے نصیب میں کامیابی و کامرانی ہے۔ اور ان خود غرض "ہشیاروں" کی ایک نہ ایک دن پول کھل کے رہے گی۔ اور وہی دن ان کی موت کا دن ہوگا۔ اور ابدی موت کا بھی اب ذرا غور کیجئے:۔

"موت کس کی ہے محبت کی کہ تلواروں کی"

"کون جگائے" بڑی ہی خوبصورت نظم ہے اور حد درجہ پرکاری لئے ہوئے ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

حسن کے خواب ناز کا عالم
پھول کی کروٹ نیند کی شبنم
پیکر سیمیں ماہ عنو وہ
زلف پریشاں نکہت سودہ
خواب کی مستی جام ربودہ
نیند کی گاگر کون اٹھائے سوتے ہوئے کو کون جگائے

"کرن" کے عنوان سے نشور نے ایک دلکش اور معنی خیز نظم تخلیق کی ہے ؎

سرد ہونٹوں پہ سرکتی ہوئی اک گرم سی چھاؤں
بازوئے عیش پہ بکھری ہوئی اک نرم سی چھاؤں
فیض ارزانیٔ مژگاں کی وہ بے شرم سی چھاؤں۔
زیست کی راہ میں منزل گہ آرام نہیں

.....

کوہ کے دل کو ہواؤں سے بدلتے دیکھا
سنگ و آہن کو بھی چاندی سے پگھلتے دیکھا
شعلۂ زر سے دل برف کو جلتے دیکھا
فتنہ فتنہ ابلیس ابھی رام نہیں

"میز کے پاس" کے عنوان سے نشورؔ نے جدید رنگ کی نظم کہی ہے جو بڑی ہی دل آویز ہے اور پڑھنے و محظوظ ہونے سے تعلق رکھتی ہے ؎

مجھ کو یاد آتا ہے اے دوست تری میز کے پاس
مئے گلرنگ جوانی کا وہ لبریز گلاس
ترے ہونٹوں کے قریب
جس کی ہر موج رقیب
محفل دولت و اقبال کا یہ جام شراب
ہے تو گردش میں مگر اس کی تمنا کا شباب
شوقِ بے مایہ سے دور
خود فریبی کا سرور

"شعبدے"، "خندہ تقدیر"، "تاب و تواں" یہ تینوں نظمیں بھی سادگی اور پُرکاری کی کامیاب نظمیں ہیں جن کا لطف مطالعہ کرنے کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

"سلیٹ" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر ماضی کی داستان بیان کرتا ہے اور ماضی کی ہی یادوں میں اپنے کو ڈبو دیتا ہے اور جب اس کا قلم صفحۂ قرطاس پر دیرینہ موتی رولتا ہے تو طبیعت اس کے اشعار کو پڑھ کر خوش اور مطمئن ہو جاتی ہے اور شاعر کے لئے اس کے زورِ بیان کے لئے صرف دعائیں ہی نکلتی ہیں ؎

کتنی صدیوں سے چلی آتی ہے تاریخ سیاہ
کارواں عقل کا ہے، رو کے ہوئے عشق کی راہ
کوئی آدم نہیں آمادۂ ایجاد گناہ
خلد میں سونے دو اس دور کے شیطاں کو کچھ اور

"سنگم" جو ایک گیت کے انداز میں ہے اور کان کے پردے سے جب اس کے الفاظ ٹکراتے ہیں تو مسرت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے شاعر نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اشعار کو نظم کیا ہے ؎

ایک ہی دنیا ایک ہی ہستی — ایک ہی صہبا ایک ہی مستی
کب تک یہ ہنگامہ پرستی — خاک کی دنیا پریم کی بستی

زندہ دل کا ساز اٹھاؤ
اپنے چمن میں عزم و عمل کے
پھول کھلاؤ دیے جلاؤ

آدمیت کا ہے یہ زمانہ — قوم پرستی راگ پرانا
بھول بھی جاؤ کہنہ فسانہ — خاک کی دنیا پریم کی بستی

داغ سے دامن پہلے بچاؤ
اپنے چمن میں عزم و عمل کے
پھول کھلاؤ دیے جلاؤ

اس مجموعہ کی آخری نظم "شیشہ گری" ہے۔ یہ بڑی خوبصورت، پرکیف اور ایمائیت سے بھری ہوئی دلکش نظم ہے۔ اسے ایک انتہا درجے کی درسی اور اخلاقی نظم کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم شاعر کی سحر بیانی کا مرقع ہے۔

ہے عیش ترا صورتِ آرام سے خالی
نغمہ ہے ترا زیست کے پیغام سے خالی
ساغر ہے ترا بادہ گلفام سے خالی
شیشہ ہے مگر پیچ سے غائب ہے پری دیکھ

یہ دور ہے تاجر یہ شب و روز ہیں ساحر
باطن سے ہم آہنگ نہیں صورتِ ظاہر
پاکیزہ ہے تقریر مگر دل نہیں طاہر
ہر چند شیریں میں ہلاہل اثری دیکھ

خود کام زمانے میں وفا ڈھونڈھ رہے ہیں
بے "قیمت نان" راہ خدا ڈھونڈھ رہے ہیں
بے نظم شیت کے بقا ڈھونڈھ رہے ہیں
مردانِ حق آگاہ کی کوتہ نظری دیکھ

۵

چوتھے دور (غیر مطبوعہ کلام) کی نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نشورؔ واحدی نے اس دور میں جو نظمیں کہی ہیں وہ تجربے کے طور پر کہی ہیں۔ ان میں وہ فنکارانہ عظمت نہیں ہے جو پچھلے ادوار میں نظر آتی ہے۔ ان کی اس دور کی نظموں کی خصوصیت سادگی، اور ان کا ربط و تسلسل، بیان کی صفائی، معتدل مزاجی اور نرم گفتاری ہے۔ اس دور کی نظمیں انسانی جذبات و احساسات کی سچی تصویریں بھی پیش کرتی ہیں۔ نشورؔ کی اس دور کی نظموں میں بوجھل پن اور خشکی کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے لہجے میں اپنائیت ہے۔

نشورؔ واحدی ایک سچے وطن پرست تھے انھیں اپنا ملک بہت عزیز تھا۔ انھوں نے عملی طور پر جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن آزادی کی تحریک کو اپنی شاعری سے جلا بخشی۔ نشورؔ کا شمار مجاہدین آزادی کی صف میں تو نہیں کیا جاسکتا مگر ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نشورؔ واحدی نے بھی آزادی کا استقبال اپنی نظم "آزادی" سے کیا ؎

لبِ شاعر چمن میں آج محو خوش کلامی ہے
گلستاں در گلستاں اک بہار شادکامی ہے
کہ اب ہندوستاں سے رخصتِ عہد غلامی ہے
شہیدانِ وطن کے نام پر پہلی سلامی ہے

نظم "آزادی" ہی کی طرح "بہار آزادی" میں بھی نشورؔ نے تقریباً انھیں جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اور جنگ آزادی میں شریک ہونے والے بہادروں کو بڑی عقیدت سے یاد کیا ہے ؎

بہار نام نہیں عیش و کامرانی کا
بہار نام ہے تعمیر زندگانی کا
بہار زندہ ہے گاندھی کی آبیاری سے

بہار رمز ہے قدوائی کی دیانت کا
بہار ذکر ہے جوہر کی جاں فشانی کا
بہار نام ہے اوراقِ زندگانی کا
شکستہ خامۂ آزاد کی روانی کا
بہار تازہ ہے راجندر کی ریاضت سے
بہار جلوہ ہے مظہر کی نکتہ دانی کا
بہار یہ ہے کہ ہر رنگ کے چمن میں ہوں پھول
چمن نمونہ ہو انداز گل فشانی کا

"روشنی کا سفر" میں بھی نشور نے آزادی کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو ؎

سرخ آنچل کی جھلک آنے لگی مشرق سے
صبح آزادیٔ کامل کا پھریرا پھیلا
دہر خوابیدہ بہاروں نے پھر انگڑائی لی
عظمت ہند کا گل رنگ سویرا پھیلا
زندگی کی شب تاریک نے دم توڑ دیا
صفحۂ نور پہ کرنوں نے رقم توڑ دیا

نشور واحدی نے اس دور میں کئی شخصیاتی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔ جو زبان و بیان کے لحاظ سے چست و درست ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نشور واحدی ان شخصیتوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور متاثر ہوئے ہیں۔

انھوں نے گاندھی جی کی پوری شخصیت کو گھنگال کے رکھ دیا ہے ؎

جو شہیدِ ذوقِ حیات ہو اسے کیوں کہو کہ وہ مر گیا
اسے یوں ہی رہنے دو حشر تک یہ جنازہ کس نے اٹھا دیا
تری زندگی بھی چراغ تھی تری مرگ غم بھی چراغ ہے
کبھی یہ چراغ جلا دیا، کبھی وہ چراغ جلا دیا
جسے زیست سے کوئی پیار تھا اسے موت آئی حسین کی
وہی خاک و خوں میں پڑا ملا جسے دردِ دل نے مزہ دیا
جو نہ داغ چہرا مٹا سکے انھیں توڑنا تھا آئینہ
جو خزانہ لوٹ سکے نہیں اسے رہزنوں نے لٹا دیا
وہ ہمیشہ کے لئے چپ ہوئے مگر اک جہاں کو زبان دی
وہ ہمیشہ کے لئے سو گئے مگر اک جہاں کو جگا دیا

ایک نظم "خدائے سخن" کے عنوان سے ہے۔ اس نظم میں نشور واحدی نے میر انیس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی شاعری کی خصوصیات بتانے کی کوشش کی ہے ؎

جانِ وطن انیس، بہارِ چمن انیس
دنیائے شاعری میں خدائے سخن انیس
ہر واقعہ میں فکر و تخیل کے ربط سے
ترتیب دے گئے عجب طرزِ فن انیس
اپنا زمانہ اپنے قلم سے سنوار کر
تنہا رہے ہیں مالکِ ہر انجمن انیس

زندہ ہے ان کے فیض سے ہر دور شاعری
صورت نگارِ زندگی فن بہ فن انیس
شیریں کلامیوں کے نمونے ہیں ان کے شعر
فردوسِ گوش نغمہ سرو سمن انیس
شاعر عرب کے گونگے ہیں ذکر حسین میں
نطقِ عرب اگر ہے تو ہندی وطن انیس

نشور کی ایک نظم " نذر اخلاص بخدمت مولانا ابوالکلام آزاد " ہے اس نظم سے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی بھرپور ترجمانی ہوجاتی ہے ؎

ہمہ کلام ہے اس کا خموش ہو جانا
سیاستیں جو الجھ جائیں ان کا سلجھانا
ہزار بار زمانہ نے اس کو پہچانا
مگر نہ مسلم ہندی نے مرتبہ جانا
نثار ہند میں اک مرد آہنی کی طرح
ضیا فگن ہے ہمیشہ وہ روشنی کی طرح
کلام اس میں نہیں کچھ ابوالکلام ہے تو
جو تا قیام قیامت رہے وہ نام ہے تو
عرب کا نظم ہے اور ہند کا نظام ہے تو
ہمارے سجدۂ پر شور کا امام ہے تو
دماغ کعبے کا پایا ہے دل مدینے کا
تو ناخدا ہے مرے ڈوبتے سفینے کا

نشور واحدی نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں. ان نظموں میں بیان کی سادگی، لفظوں کی نرمی اور اثر و جذب کی کیفیت موجود ہے. ان نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ نشور واحدی بچوں کی فطرت سے کس قدر واقف تھے.

" گرونانک " ایک مختصر نظم ہے. لیکن نشور نے گرونانک کی شخصیت کا بھرپور نقشہ چند جملوں میں کھینچ دیا ہے ؎

آؤ کہ تمھیں ہم گرونانک سے ملا دیں
فطرت کو جلا دیں
توحید کی بہتی ہوئی گنگا کا کنارا
بھارت کا سہارا

" جان پہچان " بھی مختصر نظم ہے. یہ نظم اردو کے مشہور و معروف شاعر غالب پر لکھی گئی ہے ؎

کیا حضرتِ غالب کا نہ دیدار کروگے ؟
اصرار کروگے !
ہر بات میں سو بات کی اک بات سنوگے
نغمات سنوگے

" نیل کنٹھ " کے عنوان سے ایک نظم ہے. اس نظم میں نیل کنٹھ کی ساری خصوصیات نشور نے بیان کردی ہیں اس نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

بیٹھا ہے بلندی پر — اک بانس کی پھنگی پر
ٹیں ٹیں ہے صدا اس کی — اونچی ہے نوا اس کی
رنگین سی چڑیا ہے — اک رنگ کی بڑیا ہے
ٹکڑا ہے سماؤں کا — نیلم ہے فضاؤں کا

اک جست میں یاں پہنچا
دیکھو تو کہاں پہنچا

بچوں کو چھکاتا ہے
کوؤں کا بھی باوا ہے

ڈھیلا جو اٹھاؤ گے
پھر اس کو نہ پاؤ گے